فضلِ حق خیر آبادی
اور سن ستاون
حکیم محمود احمد برکاتی
اعلیٰ حضرت نیٹ ورک
Alahazrat Network

فضلِ حق خیرآبادی

اور

سن ستاون

حکیم محمود احمد برکاتی

برکات اکیڈمی، کراچی

باطل دشمن، حریت پسند اور اسلام دوست نوجوانوں کے نام

مولانا فضلِ حق خیرآبادی نے وطنِ عزیز پر انگریزوں کے استیلا کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا اور اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے کسی بھی ممکن قربانی سے دریغ نہیں کیا، مگر انگریز کا تسلط قائم رہا۔ مولانا کے فرزند گرامی مولانا عبد الحق خیرآبادی نے بھی استخلاصِ وطن کی تمنا میں عمر گذاری اور بسترِ مرگ پر اپنے تلامذہ و اخلاف سے یہ فرما گئے کہ

"میں تو وطن سے انگریزوں کو جاتے نہ دیکھ سکا خدا تمھیں یہ روز روشن دکھائے تو میری قبر پر آکر یہ ضرور کہہ دینا کہ انگریز چلا گیا"

مولانا عبد الحق کے اخلاف و تلامذہ کی دو نسلوں سے مسلسل یہ وصیت ہم تک منتقل ہوتی چلی آرہی ہے اور انگریزی تسلط کے خاتمے کا انتظار کرتے کرتے تھک کر اب ہم یہ وصیت تم ——— نوجوانوں تک منتقل کر رہے ہیں کہ اگر خدا بزرگ تمھاری سرفروشیوں اور قربانیوں کے نتیجے میں یہ ساعتِ سعید تمھارے عہد میں لے آئے تو مولانا کی روحِ پاک کو مخاطب کر کے یہ پیامِ جانفزا ضرور سنا دینا کہ "انگریز حقیقتاً ہماری سرزمین سے چلا گیا اور ساتھ ہی اس کے علوم و نظریات اور افکار و خیالات بھی ہمارے ذہن و دماغ سے محو ہو گئے"

مولانا کی روح اِس صدائے دل نواز کے لئے گوش بر آواز ہے اور

اِک آنے والی اسلامی حکومت کے تخیل میں
لحد میں بھی کھلی ہے اس کی چشمِ انتظار اب تک

محمود احمد برکاتی
اور دوسرے خدام بارگاہِ فضلِ حق

ترتیب

پس منظر

مولینا فضل حق خیرآبادی سے میری کوئی قرابت داری تو نہیں تھی لیکن میرے اور مولینا کے خاندانوں میں برادری کا وہ قدیم رشتہ ضرور تھا جو اُودھ کے تمام قصبات میں پھیلا ہوا تھا۔ پھر سیتاپور اور خیرآباد کے درمیان فاصلہ ہی کتنا تھا، پانچ یا چھے میل۔ انقلاب سن ستاون سے پہلے سیتاپور کو مرکزیت ہی حاصل نہیں تھی، بلکہ خیرآباد ہی نظامت (کمشنری) تھی، اس لئے قیاس یہی کرنا چاہیئے کہ سیتاپور اور خیرآباد میں گھر آنگن کا بھی ایک کہاوتی رشتہ ضرور رہا ہوگا! خود مولینا خیرآبادی تمام عمر خیرآباد سے باہر ہی رہے، مگر وطنی تعلق ہمیشہ باقی رکھا۔ بہت سے افرادِ خاندان یہیں رہے اور آخری آرام گاہ تو بیشتر افرادِ خاندان کی خیرآباد ہی قرار پائی۔ یہ اور بات ہے کہ چند روز کے بعد خیرآباد میں کوئی یہ بھی بتانے والا باقی نہ رہے گا کہ مولینا فضل امام خیرابادی اور شمس العلما مولینا عبدالحق خیرآبادی کی قبریں بڑے مخدوم صاحبؒ کے مزار کے شمال مغربی گوشے میں کہاں پر تھیں؟ مولینا

خیرآبادی کے خلاف دشمن تو دشمن خود دوستوں نے وہ سلوک کیا جسکی توقع نہیں کی جاسکتی تھی! انقلاب سن ستاون کے بعد برصغیر کا مسلمان سیاسی خلفشار کے علاوہ معاشرتی، سماجی اور مذہبی افراتفری کا شکار رہا۔ مسلمانوں میں کتنی تحریکیں ابھریں اور معاشرے کو روندتی ہوئی ختم ہوگئیں۔ مولانا خیرآبادی بھی اسی چکّی میں پس گئے۔ انگریز پرست مسلمان تو مولانا سے اس لئے خفا تھا کہ وہ سن ستاون کی جنگ آزادی میں مجاہدانہ اور باغیانہ کردار کے حامل رہ چکے تھے اور کٹّر مذہبی حلقے اس لئے ناراض تھے کہ مولانا خیرآبادی حضرت شاہ اسماعیل شہید کے نظریات سے متفق نہیں تھے۔

ایک صدی بیت گئی! لیکن ذہنی گرد وغبار کے بادل نہ چھٹ سکے! انگریز جب تک برصغیر میں برسرِ اقتدار رہا آئین اور قانون کی دیواروں سے جھانک کر بہت سے چہرے پہچانے گئے، مگر نظر نہ آسکی تو ایک مولانا فضل حق کی ڈراؤنی صورت تھی جن کی "غالب ساز" شخصیت کو چھپانے کے لئے بڑے بڑے غالب شناس، ریسرچ اور تحقیق کی پُرخار وادیوں سے آگے نہ بڑھ سکے!

خدا بھلا کرے محبّی مولانا عبدالشاہد خاں شروانی کا جنھوں نے سب سے پہلے اس مظلوم شخصیت کو حیاتِ ثانیہ بخشی اور "باغی ہندوستان" لکھ کر ایک بار پھر یہ یاد دلادیا کہ مولانا فضل حق خیرآبادی صرف عالمِ دین ہی نہیں تھے بلکہ ایک مردِ مجاہد بھی تھے جنھوں نے انقلاب سن ستاون میں عزم وعمل کا ایک ایسا کردار ادا کیا تھا جسے ہندوپاک میں کبھی فراموش

نہیں کیا جا سکتا۔

مولینا شروانی کی یہ پہلی تالیف تھی ـــــ اپنے موضوع سے انھیں والہانہ عشق بھی تھا۔ اس لئے "زورِ بیان" میں وہ بعض مقامات پر اپنے موضوع سے آگے نکل گئے اور کہیں پیچھے رہ گئے۔ سب سے زیادہ غضب یہ ہوا کہ انھیں مرحوم مفتی انتظام اللہ خاں شہابی کی غیر معتبر اور غیر مستند حکایات و روایات کا بھی سہارا لینا پڑا۔ انجام ظاہر تھا۔ "خیر آبادیات" کے موضوع پر "نقشِ اوّل" کا درجہ رکھنے کے باوجود یہ تالیف اہلِ تحقیق و تنقید کی "خوردہ گیری" سے نہ بچ سکی۔

مولینا شروانی کی آواز کہاں تک پہنچی؟ میں اِس سلسلے میں بہت کچھ لاعلم ہوں، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ "باغی ہندوستان" کی اشاعت کے بعد ایک روسی مستشرق "مادام پوپولسکایا"، مولینا فضل حق خیرآبادی کے سیاسی افکار اور "فلسفۂ بغاوت" پر تحقیقی کام کرنے کیلئے ہندوستان پہنچی تھیں۔ ایک طرف تو "بیرونِ ہند" مولینا خیرآبادی کی سیاسی زندگی "فلسفۂ بغاوت" کی چھان بین ہو رہی تھی، دوسری طرف انقلاب سن ستاون کے مسلم مجاہدین آزادی کو رسوا اور بدنام کرنے کا آغاز ہو چکا تھا۔ اِس سلسلے میں غیر ملکی امداد و تعاون پر چلنے والا دہلی کا ایک نیم ادبی ماہ نامہ پیش پیش تھا۔

حسنِ اتفاق کہ اسی زمانے میں محب محترم مولینا امتیاز علی خاں عرشی رامپوری کو کتب خانۂ رامپور میں ایک ایسی تاریخی "عرضی" مل گئی جس پر

مولانا فضلِ حق خیرآبادی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اِس عرضی پر ۱۸ر فروری (۱۸۵۹ء) کی تاریخ پڑی ہوئی تھی جس سے مولانا عرشی کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ تحریر مولانا خیرآبادی کی تاریخی درخواست کا درجہ رکھتی ہے، حالانکہ اگر مولانا غور فرماتے تو بہ آسانی یہ نتیجہ نکال سکتے تھے کہ عرضی پر جو تاریخ پڑی ہوئی ہے مولانا خیرآبادی کی مہر ہونے کے باوجود وہ کسی طرح اُن کی تحریر نہیں ہوسکتی، کیونکہ مولانا خیرآبادی اس سے قبل ۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء کو گرفتار کئے جاچکے تھے اور غدر سن ستاون کے گرفتار شدگان کے ساتھ انگریز وہی سلوک کرتے تھے جو "مارشل لا" کے ہنگامی دَور میں اب بھی کیا جاتا ہے، اِس لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ مولانا خیرآبادی قیدِ فرنگ سے کوئی "عرضی" یا درخواست نواب رامپور کو پیش کرسکتے اور وہ بھی اپنی مہر لگا کر —— جو دوسرے سامان کی طرح اُن کے ساتھ جیل میں ہرگز نہیں جاسکتی تھی۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ اسی زمانے میں ڈاکٹر اطہر عباس کی ایک کتاب "سوتنتر بھارت" شائع ہوگئی جس میں اخبار الظفر دہلی کے پرانے زمانے میں چھپے ہوئے ایک ایسے فتوے کا عکس بھی شامل تھا جس پر مولانا خیرآبادی کے دستخط نہیں تھے۔ انقلاب سن ستاون میں دہلی کے علما نے کئی فتوے دیے تھے جن کا تذکرہ سن ستاون کے سلسلے میں کہیں کہیں جگہ ملتا ہے، لیکن مولانا عرشی نے اس مطبوعہ فتوے ہی کو اول و آخر فتویٰ قرار دیکر ایک طویل مقالہ تحریر فرمایا اور وہ بھی اس روشنی میں کہ مولانا فضل حق نے سن ستاون کی جنگِ آزادی میں

کسی قسم کا کردار ادا نہیں کیا تھا۔ چونکہ مولینا عرشی نے یہ مقالہ لکھنے سے پہلے اپنے ذہن کو منفی انداز میں تیار کر لیا تھا اس لئے انھوں نے اپنی دیرینہ روایات کے خلاف اپنے گرد وپیش پر قطعاً نظر نہیں ڈالی اور ضروری مواد کو دیکھے بغیر عجلت میں یہ مضمون قلم بند فرما دیا، حالانکہ اگر وہ چاہتے تو خود اُن کے گرد وپیش ایسا مواد پھیلا ہوا تھا جسے ملاحظہ فرماکر وہ اپنی دیرینہ روایات کو قائم رکھ سکتے تھے۔

میں مولینا عرشی کی علمی سنجیدہ روی، شائستگی اور متانت کا ہمیشہ معترف رہا اور آج بھی اُن کی تحقیقی و علمی عظمت کا قائل ہوں اسی لئے جب میں نے مولینا کے مضمون میں مولینا خیرآبادی کے متعلق یہ جملے دیکھے تو کچھ دیر تک اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا:

> "ورنہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مولینا خیرآبادی نے "غیر شرعی شوقِ شہادت" سے مجبور ہو کر ایسا "جھوٹ" بولا تھا جو اگر باور کر لیا جاتا اور اس کے مطابق انھیں پھانسی دے دی جاتی تو وہ ایک طرح کی خودکشی کے مرتکب ہوتے۔"

(صفحہ ۱۰-۱۱ ماہنامہ تحریکِ دہلی اگست ۱۹۵۷ء)

مولینا عرشی نے اس موضوع کے ساتھ تحقیقی برتاؤ نہیں کیا؟

نواب رامپور کے نام اس عرضی کو بنیاد بنا کر مولینا عرشی نے یہ مفروضہ قائم کر لیا۔ مولینا خیرآبادی پر حسب ذیل تین الزام عائد کیے گئے تھے:

(۱) خان بہادر کے ساتھ بریلی میں تعاون اور مولینا کی طرف سے

پیلی بھیت میں نظامت۔

(۲) پھر خان علی خاں کی طرف سے محمدی کی چکلہ داری۔

(۳) پھر ایک باغی لشکر کی کمان داری۔

مولانا عرشی نے اس عرضی کو بنیاد بنا کر یہ تین الزامات اخذ کئے ہیں اور انہیں الزامات کا سہارا لے کر مولانا فضل حق خیرآبادی کے "غیر شرعی شوق شہادت" اور "جھوٹ" کا تحقیقی محاسبہ فرمایا ہے۔ لیکن آپ انگشت بدنداں رہ جائیں گے جب مولانا فضل حق کی اس فرد جرم میں ان تین الزامات کے برعکس صرف یہ دو ہی الزام ملیں گے جنھیں جناب مالک رام نے مولانا فضل حق کے خلاف اس سرکاری فائل سے پیش کیا ہے جس کی بنیاد پر مولانا خیرآبادی کے خلاف "مارشل لا کورٹ" نے جرم بغاوت لگا کر انھیں کالے پانی کی سزا دی تھی۔

مارشل لا کورٹ کی یہ فرد جرم تین نہیں صرف دو الزامات پر مبنی ہے:

۱۔ پوری بغاوت کے دوران میں بالعموم لوگوں کو بھڑکانا۔

۲۔ ۱۸۵۸ء میں بالخصوص اودھ میں بغاوت پر اکسانا۔

مولانا عرشی کی عائد کردہ فرد جرم میں کتنا فرق ہے؟ اسے ایک قانون داں ہی محسوس کر سکتا ہے، کیونکہ قانون کی اساس و بنیاد الفاظ پر رکھی گئی ہے۔ اگر بقول مولانا عرشی "عرضی" مورخہ ۱۸ر فروری ۱۸۵۹ء سے یہی نتیجہ نکلتا ہو جو انھوں نے نکالا ہے تب بھی وہ فرد جرم کی حیثیت نہیں رکھتی اور نہ اسے بنیاد بنا کر کسی کو جھوٹا قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ

اس مقدمہ کی روداد سے یہ ثابت ہے کہ مولینا خیرآبادی کے مقدمہ کی کارروائی کا براہِ راست تعلق ان واقعات سے نہیں تھا جن کا تذکرہ مولینا عرشی نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔

مولینا فضلِ حق سے منسوب عرضی (۱۸ فروری ۱۹۵۹ء) کے علاوہ مولینا عرشی نے "سوتنتر دہلی" میں چھپے ہوئے اس فتوے کے عکس کو بھی بنیاد بنایا ہے جو "صادق الاخبار دہلی" ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء سے لیا گیا ہے۔ اور جس پر مولینا خیرآبادی کے دستخط نہیں ہیں۔ یہ فتویٰ سب سے پہلے اخبار "الظفر دہلی" میں چھپا تھا، لیکن مولینا عرشی اب سے ڈیڑھ سو سالہ قدیم اغلاطِ کتابت و طباعت کی مشکلات سے باخبر ہونے کے باوجود کسی طرح یہ ثابت نہیں کر سکے کہ "صادق الاخبار" میں چھپا ہوا فتویٰ اخبار الظفر دہلی کی ہو بہو نقل ہے۔ جن لوگوں کے سامنے ۱۸۵۷ء سے پہلے کی "لیتھو" طباعت کی اسقام ہیں وہ کسی طرح بھی اس پر بھروسہ نہیں کر سکتے کہ الظفر سے نقل کرنے کے باوجود یہ تحریر کتابت کی اغلاط سے پاک ہے۔ مجھے اس بات پر قطعاً اصرار نہیں ہے کہ یہ فتویٰ وہی جہاد کا فتویٰ ہے جس پر مولینا خیرآبادی کے دستخط تھے۔ مولینا عرشی جیسے محتاط محقق سے مجھے یہ بھی توقع نہیں تھی کہ وہ اپنی تحقیقی عمارت کو ایسی بودی اور کمزور بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

اگرچہ مولینا عرشی نے فتوے کی بحث میں مفتی صدر الدین آزردہ کے "شہدت بالخیر یا شہدت بالجبر" کا غیر متعلق تذکرہ مناسب سمجھا۔

کاش قدیم لیتھو طباعت کی لاشعوری مشکلات کو سامنے رکھ کر وہ "صادق الاخبار" میں چھپے ہوئے فتوے کے عکس سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے!

مولانا عرشی نے جس بحث کا آغاز اگست ۱۹۵۷ء میں کیا تھا، اس کا بہت کچھ تکملہ جناب مالک رام کے اس مضمون (مولانا فضل حق خیرآبادی) پر ہوا جو ماہنامہ تحریکِ دہلی بابتہ جون ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔

جناب مالک رام نے ایک جزو سے زائد ضخامت پر مشتمل اس مضمون میں حکومتِ ہند (نئی دہلی) کے "نیشنل آرکائیوز آف انڈیا" فارن پولٹیکل ستمبر ۱۸۶۰ء نمبر ۵۵ کے ریکارڈ کی تلخیص کر کے شائع کر دی۔ مگر اس التزام کے ساتھ کہ مولانا عرشی نے تحقیق کی جو نئی راہیں نکالی ہیں اُن پر حرف نہ آنے پائے۔

لیکن میں جناب مالک رام کی نیک نیتی اور محتاط نگاری کے احترام کے باوجود یہ عرض کروں گا کہ وہ قانونی موشگافیوں کی پُرپیچ وادیوں سے یقیناً واقف نہیں ہیں۔ اگر اس "مثل" کی تلخیص سے پہلے وہ "بہادر شاہ ظفر" کے مقدمۂ بغاوت کی ترتیب اپنی نظر میں رکھتے تو شاید پڑھنے والوں کو صحیح نتیجہ نکالنے میں زیادہ آسانیاں پہنچا سکتے تھے۔

کیونکہ مارشل لا کا وہ مقدمہ بھی "آرمی ایکٹ" ہی کے تحت چلایا

گیا تھا۔ اس قسم کے مقدمات کی فائلوں کی ترتیب کچھ اس طرح پر کی جاتی ہے:

(۱) استغاثہ (۲) فردِ جرم (۳) کارروائی مقدمہ (۴) پلیڈِنگس (۵) کاغذات مدخلہ فریقین (۶) درمیانی اور متفرق درخواستیں۔

آرمی ایکٹ ہو یا تعزیراتِ ہند ہر مقدمہ کی فائل تقریباً انھیں اجزا پر مشتمل ہوتی ہے۔ کسی مقدمہ کی کارروائی پر تحقیقی بحث کرنے کے لئے تمام اجزا کو سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے لیکن مالک رام صاحب نے صرف اپنے مفید مطلب باتوں کی تلخیص پیش کی ہے۔ یہ انداز وکیلانہ تو ہے محققانہ نہیں۔ جناب مالک رام کو کم از کم ان کاغذات کی نقل ضرور پیش کرنی چاہیئے تھی جن کا حوالہ مقدمہ میں دیا گیا ہے، مثلاً کمشنر دہلی کی وہ رپورٹ جس کا ذکر تجویز مقدمہ میں موجود ہے۔

لیکن ان تفصیلات کے باوجود مقدمہ کے مضمرات پھر بھی تحقیق طلب رہ جاتے ہیں جو مولینا فضل حق کے سرکاری وکلاء میسرز سون ہُو۔ بیبی اینڈ لیزلی کے مشورے کے مطابق تھے اور ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کے خلاف نفرت رکھنے کے باوجود انگریز اپنے فرض کی ادائی میں کتنے دیانت دار تھے۔

یہ کربناک "پس منظر" ہے ان اوراق کی تالیف کا جسے میری درخواست پر برادرم جناب حکیم سیّد محمود احمد صاحب برکاتی نے

اپنے روایتی علمی اور تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ یوں تو یہ فرض میں نے اپنے اوپر عائد کر لیا تھا اور محبِّ محترم مولینا عرشی سے وعدہ بھی کر لیا تھا، لیکن جب برکاتی صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کو اپنے سے زیادہ باصلاحیت اور اہل پاکر انھیں دعوتِ فکر دی ـــــ اور شکر ہے کہ یہ کام انھیں ہاتھوں سے انجام پا رہا ہے جو "خیرآبادی" مکتبِ فکر کے جائز وارث و جانشین اور پاک و ہند میں خیرآباد کے نمائندے ہیں۔

برکاتی صاحب اس خانوادۂ علم و دانش سے تعلق رکھتے ہیں جس کا براہِ راست معنوی رشتہ خیرآباد سے ہے۔ آپ کے جدِّ امجد حضرت مولینا حکیم سیّد برکات احمد صاحب مرحوم نہ صرف شمسُ العلما علّامہ عبدُالحق خیرآبادی کے ارشد تلامذہ میں تھے، بلکہ اپنے علم و فضل کے اعتبار سے اپنے عہد کے اُن جیّد علما میں شمار کیے جاتے تھے جن کا نام ہر مجلسِ علم و ادب میں عزّت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ برکاتی صاحب کے اندازِ فکر میں تحقیق کے علاوہ علمی سنجیدہ رَوی کا وہ وقار بھی ہے جسے وہ حضرات بھی محسوس کریں گے جو کسی وجہ سے ان کے ہم خیال نہ ہو سکیں۔

نادم سیتاپوری

۲۵؍مارچ ۱۹۷۵ء

تقریب

مولینا فضلِ حق خیرآبادی نے سن ستاون (سنہ ۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۹ء) کے معرکہ جہاد میں جو نمایاں حصّہ لیا تھا وہ تاریخ ملت کا ایک واقعہ تھا۔ ناقابلِ انکار بھی اور قابلِ فخر بھی، مگر اس کے ساتھ عجیب معاملہ رَوا رکھا گیا۔ پہلے تو جنگِ آزادی کی تاریخ میں مولینا کا نام لینا بھی گوارا نہیں کیا جاتا تھا، مگر جب سے مولینا عبدالشاہد خاں صاحب شروانی کی "باغی ہندوستان" شائع ہوئی تھی مولینا کا نام لیا جانے لگا تھا اور مولینا کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا اعتراف کیا جانے لگا تھا لیکن مولینا امتیاز علی خاں صاحب عرشی اور جناب مالک رام کے مضامین کی اشاعت (ماہنامہ تحریک دہلی) کے بعد پھر یہ کہا جانے لگا، بلکہ لکھا جانے لگا کہ مولینا نے اس معرکے میں کوئی حصّہ نہیں لیا تھا۔

حیرانی تھی کہ ایک حقیقت کے انکار کی ضرورت کیوں لاحق ہوگئی؟ اور انتظار تھا کہ کوئی "فضل حق پسند" نہیں تو حق پسند اہلِ قلم ہی اس زیادتی کی تلافی کے لئے کمربستہ ہو اور احقاقِ حق کا فرض ادا کرے۔ آخر کچھ ادھر سے مایوسی اور کچھ حضرت نادم سیتاپوری کے اُکسانے پر خود میں نے ہمت کی اور ادبیاتِ غدر کا جو حصّہ بھی میسر آسکا اور اپنے

غیرِ علمی مشاغل کے ہجوم میں جتنا استفادہ بھی اس سے ممکن ہُوا کر کے مولانا کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی کچھ تفاصیل فراہم کیں۔ اب یہ تفاصیل آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

آئندہ صفحات میں جو تفاصیل آپ ملاحظہ فرمائیں گے وہ صرف اشارات ہیں اور ان کی حیثیت اربابِ قلم اور محققین کے لئے دعوتِ عمل سے زیادہ نہیں ہے۔ ادبیاتِ غدر میں سے بڑا حصّہ مجھے دستیاب نہیں ہو سکا اور جو کتابیں ملیں اُن سے میں مصروفیت اور انگریزی پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے کما حقہٗ استفادہ نہ کر سکا، جو بھی جواں سال و جواں عزم مورخ اس مہم پر کمر بستہ ہوگا وہ مجھ سے کئی گنا زیادہ مواد۔ یا بقول مولانا ماہر القادری لوازمہ فراہم کرے گا۔

میں نے حق پرستی کا دامن کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور اپنے موضوع کے ساتھ دانستہ کوئی بے انصافی نہیں کی ہے مثلاً میں نے یہ نہیں اصرار کیا کہ مولانا نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا۔ صرف یہ ثابت کیا ہے کہ فتوے نہ دینے کے جو دلائل دیئے گئے ہیں اُن میں وزن نہیں ہے۔

غدر پر بہت سا مواد دفترِ ہند (انڈیا آفس) کے کتب خانے میں مقفل ہے۔ اس کی اِشاعت سے پہلے حتمیت کے ساتھ اظہارِ رائے کرنا بھولپن ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں اور مبارک شاہ کوتوال کی یادداشتیں اب ہاتھ لگی ہیں اور غدر کے ٹھیک سو سال بعد جناب ڈاکٹر سید معین الحق نے دریافت کی ہیں۔" یہ دونوں غدر

کے سلسلے میں بڑے اہم ماخذ ہیں۔

میری یہ کوشش ایک مظلوم کی حمایت و دفاع کی (وکیلانہ نہیں) منصفانہ کوشش ہے۔ جہاد تو مولٰینا کی حیات کا صرف ایک رُخ تھا ورنہ ایک مفکر، متکلم، ادیب، منطقی اور فلسفی کی حیثیت سے کئی عظیم المرتبت کتابوں کے مصنّف کی حیثیت سے وہ تاریخِ ملت کے ایک لازوال ولا فانی اور بے مثال و بےنظیر شخص تھے۔ جہاد اُن کی کلاہِ افتخار کا واحد ہیرا نہیں تھا۔ اگر معاصر مآخذ سے یہ مواد فراہم نہ ہوتا جو ہُوا تو آپ مجھے بھی جناب مالک رام کا ہمنوا پاتے۔ مولٰینا فضلِ حق نے عدالت کے سامنے اپنی بے گناہی کے سلسلے میں جو کچھ کیا اور اپنی رہائی کے لئے جو کچھ کیا، صاف کہتا ہوں کہ یہ خلافِ عزیمت فعل تھا اور حیاتِ فضل حق میں یہ ورق کاش سیاہ ہو جاتا۔ مانا کہ کئی مجاہدین[۱] نے بھی یہی کیا، مگر کاش مولٰینا فضل حق اپنے شاگرد کے شاگرد مولٰینا معین الدین اجمیری کی طرح اپنے جرم کا اعتراف فرما لیتے۔ مولٰینا معین الدین نے ۱۹۲۱ء میں عدالت کے سامنے حکومتِ برطانیہ سے اپنی عداوت اور استیصالِ حکومت کے لئے اپنے عزمِ صمیم کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم حکومت کے خلاف اپنی تمام قوت اور تمام ذرائع استعمال

---

[۱] مثلاً خان بہادر خاں اور بہادر شاہ دونوں نے یہی کہا کہ ہم مجرم نہیں ہیں۔

کریں گے۔ مولانا نے حکومت کو چیلنج دیا کہ

"ہم اس کے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے اور اس کو
تباہ کر دینا چاہتے ہیں"

چوں کہ یہ کتاب مولانا کی شرکتِ جہاد کے سلسلے میں اغلاط کے ازالے اور تصحیح کے لئے لکھی گئی ہے، اس لئے آخر میں میں نے اپنا ایک مضمون بھی شامل کر دیا ہے جس میں پوری ایک صدی کی اغلاط کی تصحیح کی گئی ہے۔

اِس مضمون میں مجھے اپنی طبیعت کے خلاف کئی شخصیتوں پر بھی کلام کرنا پڑا ہے، مگر تصحیح اس کے بغیر ممکن نہیں تھی!

محمود احمد برکاتی

کتاب کے آخر میں جناب حکیم محمود احمد برکاتی ہی کا ایک مقالہ مولانا فضل حق خیرآبادی اور معرکۂ ہنومان گڑھی شامل کیا جا رہا ہے اس طرح اس اشاعت کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

محمد عبد الحکیم شرف قادری

مولانا فضلِ حق خیرآبادی

مولانا فضلِ حق خیرآبادی الٰہیات، علمِ کلام، منطق اور فلسفے کے امامِ وقت تھے۔ برِعظیم کے معقولین میں ابتدا سے اب تک ان کا کوئی مثیل و نظیر نہیں ہے۔ عالمِ اسلام کے فلاسفہ میں وہ نصیرالدین طوسی میر باقر داماد اور صدر شیرازی کے ہم صف اور ہم رتبہ محققین میں سے تھے۔ فلسفے، الٰہیات اور منطق میں ان کی تالیفات شروح اور حواشی فلاسفۂ عالم میں ان کے مقام کا تعین کرتی ہیں۔ نصف صدی تک مسلسل تدریس کرتے رہے اور تلامذہ کی ایک معقول تعداد نے آپ سے کسبِ کمال کیا اور یوں منطق و کلام کے ایک جدید مکتبِ فکر ــــــ "مکتبِ خیرآباد" کے بانی قرار پائے۔

علوم میں اس علوِ مقام کے ساتھ مولانا کی حیات کا ایک تابناک باب یہ ہے کہ آپ ایک مدبر سیاسی اور مجاہد بھی تھے۔

یہی باب ہمارا موضوع ہے!

مولٰینا کے سوانح حیات مختصراً یہ ہیں : ولادت ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء فراغتِ درس (بعمر ۱۳ سال) ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء ملازمت کمپنی ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء سے کچھ قبل، ولادت فرزند گرامی (مولٰینا عبدالحق) ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء - ولادت فرزند (علامۃ الحق) ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء - وفات والد ماجد (مولٰینا فضل امام خیرآبادی) ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء کمپنی کی ملازمت (سررشتہ داری عدالت[1] دیوانی دہلی) سے استعفاء ۱۲۴۵ھ/۱۸۳۱ء کے اوائل میں، ملازمت ریاست جھجر میں ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۲ء - پھر چند سال الور، سہارن پور اور ٹونک میں قیام کے بعد ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء سے ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء تک ریاست رام پور میں قیام (محکمہ نظامت اور مرافعہ عدالتین کے حاکم کی حیثیت سے) ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء سے ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء کے اوائل تک لکھنؤ میں قیام (کچہری حضور تحصیل کے مہتمم اور صدر الصدور کی حیثیت سے) ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء کے ابتدائی مہینوں میں الور تشریف لے آئے اور رمضان ۱۲۷۳ھ/مئی ۱۸۵۷ء میں سن ستاون کی جنگِ آزادی کے آغاز پر دہلی تشریف لے آئے اور پورے ڈیڑھ سال (مئی ۱۸۵۷ء سے دسمبر ۱۸۵۸ء) تک دہلی اور اودھ کے مختلف اضلاع میں مجاہدینِ حریت کی رفاقت، اعانت اور قیادت فرماتے

---

[1] اُس سررشتہ داری میں انھیں وہ دبدبہ اور قوت و شوکت حاصل تھی جو اس زمانے میں ڈپٹی کمشنر کو ہے۔ آپ کے مکان پر اہلِ مقدمہ کا دربار لگا رہتا تھا اور زندگی نہایت عزت و احترام سے بسر ہوتی تھی"۔ مرزا حیرت، حیاتِ طیبہ ص ۱۰۲

رہے۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں گرفتار کر لئے گئے۔ مقدمہ چلا اور جرم ثابت ہونے پر تمام زرعی اور مسکونہ جائداد اور ذخیرۂ نوادر کتب خانے کی ضبطی اور حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا سُنا دی گئی۔ اکتوبر ۱۸۵۹ء میں پورٹ بلیر (جزائر انڈمان) پہنچا دیئے گئے جہاں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ / ۲۰ اگست ۱۸۶۱ء کو ۶۶ سال کی عمر میں وصال ہوا۔

مولانا نے "سن ستاون" کی جنگ آزادی میں جو حصّہ لیا وہ کسی وقتی جوش اور جذبے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ جنگِ آزادی برپا ہونے سے برسوں پہلے آپ برعظیم پر فرنگی راج کے استیلاو تسلّط، فرنگی حکام کی نااہلی اور ستم شعاری کی وجہ سے بد دل، بیزار اور نفور رہتے اور مولانا نے اپنی عملی زندگی کا آغاز اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت ہی سے کیا مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملازمت ناپسند ہونے کے باوجود والد ماجد کے حکم اور خواہش کی ایک سعادت مندانہ تعمیل تھی۔ ملازمت کے تین چار سال بعد ہی ۱۸۱۸ء میں والد ماجد کے نام اپنے ایک مکتوب میں اس ملازمت سے بیزاری کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:[۱]

"میں خدا کے فضل و کرم سے خوش حال اور مطمئن ہوں مگر ملازمت میں ذلّت و خواری بہت ہے۔ حاکم کے سامنے مستقل حاضر رہنا پڑتا ہے اور اس کے وہ احکام اِملا

---

[۱] مولانا کی قلمی بیاض ص ۲۸ (مملوکہ مولوی حکیم نصیر الدین ندوی، کراچی) ہم نے اس عربی مکتوب کا اردو میں ترجمہ پیش کیا ہے۔

کرنا ہوتے ہیں جو قابلِ قبول نہیں ہوتے۔ قسم خدا کی اگر
مجھے رسوائی کی شرم نہ ہوتی تو کبھی کا کہیں اور منتقل
ہو جاتا اور متوکلانہ زندگی بسر کرتا۔"

شاید والد ماجد کا اصرار ملازمت کے برقرار رکھنے کے سلسلے میں جاری رہا اور مولانا صبر و تحمل سے کام لیتے رہے مگر والد کی رحلت کے معًا بعد مولانا نے غلامی کا یہ لبادہ اتار پھینکا اور والئ جھجر نواب فیض محمد خاں کی دعوت پر ریاست جھجر کا قیام منظور فرما لیا۔ مرزا غالب نے "آئینہ سکندری" (کلکتہ) کے مدیر کے نام اپنے مراسلے[۱] (مورخہ ۱۳ جنوری ۱۸۳۲ء) میں اس واقعہ پر جن جذبات کا اظہار کیا ہے اگر مولانا سے مرزا غالب کے مراسم اخوت و اتحاد کے پیشِ نظر ہم انھیں مولانا کے جذبات و تاثرات تصور کریں تو بے جا نہ ہوگا، خصوصًا اس لیے کہ فرنگی حکومت کے متعلق مرزا غالب نے ایسے الفاظ کہیں اور استعمال نہیں کیے:

بے تمیزی و قدر ناشناسیِ حکامِ فرنگ	حکامِ فرنگ کی بے تمیزی اور قدر
آں ریخت کہ فاضلِ بے نظیر و المعیِ	ناشناسی نے یہ رنگ دکھایا کہ
یگانہ مولوی حافظ فضل حق از سر رشتہ	فاضلِ بے نظیر و المعی یگانہ مولوی
داری عدالت دہلی استعفا کردہ خود	حافظ محمد فضل حق نے عدالتِ
را از ننگ و عار وارہانند حقا کہ از	دیوانی کی سررشتہ داری سے
پایۂ علم و فضل، دانش و کنش مولوی	استعفا دیکر ننگ و عار سے نجات

---

[۱] کلیات نثرِ غالب ص ۱۴۸

فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد یک واماند باز۔ آں پایہ را بسر رشتہ داری عدالت دیوانی سنجند ایں عہدہ در مرتبہ وے خواہد بُود۔

پائی۔ واقعہ یہ ہے اگر مولٰینا کے علم و فضل کے ایک فی صدی کا عدالتِ دیوانی کی سررشتہ داری سے موازنہ کریں تو اس عہدہ کا پلّہ ہلکا نکلے گا۔

مولٰینا نے اس قطع تعلق پر ہی اِکتفا نہیں فرمایا کہ انگریز حکام کے ظالمانہ احکام و اقدامات اور اس سے عوام کی تکالیف اور پریشانیوں کا بھی بہ تفصیل جائزہ لیتے رہے اور ان تکالیف کے ازالہ کے لئے جد و جہد بھی فرماتے رہے۔ مولٰینا کی ان سرگرمیوں کا پتہ ہمیں اس درخواست[1] سے

---

[1] یہ درخواست جناب نثار احمد فاروقی کو اپنی ایک قلمی بیاض میں دستیاب ہوئی ہے اور انھوں نے نوائے ادب بمبئی (جلد ۱۳ شمارہ ۳ جولائی ۱۹۶۲ء) میں شائع کی ہے۔ فاروقی صاحب نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ درخواست بہادر شاہ ظفر کے نام ہے مگر ہمارا خیال ہے کہ یہ اکبر شاہ ثانی کے نام ہے کیونکہ اس میں سر چارلس مٹکاف کے ایک تازہ حکم کا ذکر ہے اور سر چارلس مٹکاف پہلے ۱۸۱۱ء سے ۱۹ تک اور پھر دوبارہ ۱۸۲۵ء سے ۱۸۲۷ء تک دہلی کے ریزیڈنٹ رہے تھے اور ۱۸۴۶ء میں وفات پا گئے تھے۔ (ملاحظہ ہو ڈکشنری آف انڈین بائیوگرافی ص ۲۸۷ مطبوعہ ۱۹۰۶ء از بٹ لینڈ)۔ اس لئے یہ درخواست ۱۸۲۷ء سے پہلے کسی سن میں لکھی گئی ہے اور اس دور میں اکبر شاہ ثانی زندہ تھے۔ بہادر شاہ ظفر تو ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوئے تھے۔ یہ درخواست افسوس ہے کہ ناقص الآخر ہے۔

سے چلتا ہے جو مولینا نے "سن ستاون" سے کم سے کم ۳۰ سال پہلے اکبر شاہ ثانی (ف ۱۸۳۷ء) کے نام رعایائے شہر کی طرف سے مرتب کی تھی۔ ذیل میں اس طویل فارسی درخواست کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے (اصل فارسی متن ضمیمہ نمبر ا میں ملاحظہ فرمائیں)

ملک کی اقتصادی حالت

یہاں کے باشندے ہندو ہوں یا مسلمان ملازمت، تجارت، زراعت، حرفت، زمینداری اور دریوزہ گری پر معاش رکھتے ہیں۔ انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد سے معاش کے یہ تمام وسائل مسدود و مفقود ہو گئے ہیں۔ ملازمت کے دروازے شہریوں پر بند ہیں، تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ کپڑا، سوت، ظروف اور گھوڑے وغیرہ تک وہ فرنگ سے لیکر خود فروخت کر کے نفع کماتے ہیں۔ معافی داروں کی معافیاں ضبط کر لی گئی ہیں۔ کسانوں کو محاصل کی کثرت نے بدحال کر دیا ہے۔

ان چاروں طبقوں کی زبوں حالت کے نتیجے میں اہل حرفہ اور ان سب کے نتیجے میں دریوزہ گر تنگئ معاش کے شکار ہیں۔

دہلی کی اقتصادی زبوں حالی

دہلی میں ہوڈل وغیرہ بہت سے پرگنے جاگیر میں شامل

تھے اور جاگیرداروں کے یہاں ہزاروں آدمی فوج، انتظامی امور اور شاگرد پیشہ کی خدمت پر مامور تھے۔ اب یہ پرگنے اور دیہات و مواضعات انگریزوں نے ضبط کر لئے ہیں اور لاکھوں کسان بے روزگار ہو گئے ہیں۔ بیواؤں کی معاش چرخہ کاتنے، رسیاں بٹنے اور چکی پیسنے پر موقوف تھی۔ اب رسّی کی تجارت حکومت (کمپنی) نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور ہاتھ کی چکیوں کی جگہ پن چکیاں لگ گئی ہیں تو یہ ذریعۂ معاش بھی جاتا رہا۔ عوام کی اس بے بضاعتی اور بے روزگاری کی وجہ سے اہل حرفہ اور سا ہوکار بے روزگار اور رزق سے محروم ہو گئے ہیں۔

ان سب پر مستزاد اب چارلس مٹکاف نے یہ حکم دیا ہے کہ غریب زرِ چوکیداری[1] ادا کیا کریں۔ یہ ٹیکس پہلے کبھی نہیں لیا جاتا تھا۔

دوسرا حکم یہ ہوا ہے کہ ہر گلی کے دروازے پر پھاٹک لگایا جائے جس کا کوئی فائدہ معلوم و متصوّر

---

[1] چوکیدارہ ٹیکس کا قانون یوپی میں سنہ ۱۸۱۴ء میں نافذ ہوا تھا۔ ممکن ہے دہلی میں بھی اسی سال یا چند سال بعد یہ قانون نافذ ہوا ہو۔ اس سے بھی اس درخواست کے عہد کا تعین ہوتا ہے۔

نہیں ہے۔

تیسرا حکم یہ ہوا ہے کہ ان پھاٹکوں کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات مقرر ہوں جس سے ہمیں مشکلات کا سامنا ہے۔

چوتھا حکم یہ ہوا ہے کہ ہر محلے میں ۵/۵ پنچ مقرر کیے جائیں۔"

اس درخواست سے جہاں مولانا کی سیاسی بصیرت اور عوام کے مسائل اور شہری زندگی کی مشکلات پر اُن کی گہری نگاہ کا ثبوت ملتا ہے وہاں یہ بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ انھوں نے ان تمام مشکلات و مصائب کے سرچشمہ پر انگلی رکھ کر صحیح تشخیص کر لی تھی اور اسباب کا تجسس کر کے اس کا تعین فرما دیا تھا کہ یہ سارے مسائل غیر ملکی حکمرانوں کے پیدا کردہ ہیں۔ پھر یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ درخواست دہلی کے ریزیڈنٹ کے نام نہیں ہے جو شہر و ضلع کا حقیقی حاکم تھا، بلکہ "حضور جہاں پناہ" کے نام ہے یعنی ساکنان دہلی کے مسائل لال قلعے کے بے اختیار و محروم اقتدار مغل "شہنشاہ" (اکبر شاہ ثانی) کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، حال آں کہ لال قلعہ ۱۸۰۳ء سے ویران تھا اور اکبر شاہ ثانی کے والد شاہ عالم کی حکومت دہلی سے پالم تک رہ گئی تھی۔ اکبر شاہ ثانی کی تو صرف لال قلعے تک محدود تھی۔ خود "شہنشاہ" نے کمپنی کی وظیفہ خواری پر قناعت فرما لی تھی اور عوام بھی اپنی تمام

ضروریات کے سلسلے میں نئے حکمرانوں کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ انہی کی عدالتوں میں انصاف کے لئے جاتے تھے اور انہی کو سلام کرنے کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔ ان حالات میں برعظیم کا ایک عالم دین ـــــ جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ سیاست نہیں جانتا ـــــ عوام کو دوبارہ لال قلعے کے پھاٹک کی طرف لئے جا رہا ہے اور ان کی طرف سے درخواست لکھ کر اور اُن کے حالات و خیالات کا ترجمان بن کر ان کو حضور "جہاں پناہ" کے دیوانِ عام میں لا کھڑا کرتا ہے اور اس طرح ایک پیچیدہ نفسیاتی تحریک چلاتا ہے جس سے ایک طرف عوام کو دوبارہ اپنے جانے پہچانے مرکزِ حکومت سے گرہ کشائی اور حل مشکلات کی توقعات پیدا ہوں گی، دوسری طرف خود ان جہاں پناہ کی خودی بیدار ہونے کے امکانات ابھریں گے اور ان کی غیرت و حمیّت بھی ممکن ہے انگڑائی لے کر جاگ اٹھے۔ تیسری طرف برطانوی حکومت کے کارکن چونکیں گے کہ یہ کیا ہوا ہے؟ سمت قبلہ پھر تبدیل ہو رہی ہے اور چونک کر وہ ایک طرف تو اُن مشکلات پر توجّہ دیں گے دُوسری طرف شاہ کے ساتھ اپنے رویّے میں نرمی اِختیار کریں گے اور ان گستاخیوں اور اہانت کوشیوں کو لگام دیں گے جن کا سلسلہ انھوں نے کئی سال سے شروع کر رکھا تھا۔

مولٰینا کے انگریزوں کے متعلق یہ جذبات صِرف وطنیت پر مبنی نہیں تھے یعنی وہ برعظیم پر انگریزوں کے بڑھے ہوئے تسلط کے

اس لئے خلاف نہیں تھے کہ وہ ملکی نہیں تھے، غیر ملکی تھے، ان کا تعلق ایشیا سے نہیں تھا یورپ سے تھا، بلکہ اس کی بنا مذہب پر تھی، اُن کو غم انگریزوں کے قبضے کا نہیں، نصاریٰ کے قبضہ کا تھا اور نصاریٰ سے موالاۃ شرعاً ممنوع ہے اور قرآنِ کریم میں مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ سے ولا (دوستی) کی نہی فرمائی گئی ہے۔ (المائدہ ۵۱) ایک قصیدے[1] میں فرماتے ہیں :

لم اقترف ذنبًا سوی ان لیس لی مع ھٰولا مودۃ وولاء

فولائھم کفر بنص محکم مافیہ للمرء المحق مراء

کیف الولاء وھم اعادی من لہ خلق السماء والارض والانشاء

میرا قصور صرف یہ ہے کہ میں نے ان (نصاریٰ) سے محبت اور دوستی نہیں کی کیونکہ ان کی دوستی بنص محکم کفر ہے، اس بات میں ایک حق پرست آدمی کے لئے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بھلا ان سے کیسی دوستی؟ جو اُس ذاتِ گرامی سے عداوت رکھتے ہیں جو وجہ تخلیقِ ارض و سما ہے" (صلی اللہ علیہ وسلم)

مولینا ان "النصاریٰ البراطنہ" (برطانوی عیسائیوں) کے عزائم اور اقدامات کا بغور مطالعہ کر رہے اور بڑے دکھ کے ساتھ محسوس کر رہے تھے کہ

ھموا بان ینصروا کلاً من قطانھا انگریزوں نے ملک کے تمام امیر و غریب

---

[1] قصائد فتنۃ الہند، قصیدۂ ہمزیہ

وسکانہا ورؤسہا ووجوہہا واعیانہا ونبالہا ونذالہا واجلتہا واذلتہا تنصیرًا[1] — چھوٹے بڑے، مقیم ومسافر، شہری اور دیہاتی باشندوں کو نصرانی بنانے کا منصوبہ بنایا ہے۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریز اب شعائر دین اور احکام شرع پر عمل میں بھی مزاحم ہو رہے ہیں،

والی غیرذٰلک مما فی قلوبہم من المنی اوالاھوا وماتکن صدورھم من الفتن والاسوار کالافتتان بمنع الختان ورفع الحجاب من العقائل والخواتین وطمس سائر احکام الدین الحکم المتین[2] — ان (اقدامات) کے علاوہ ان کے دل میں اور بہت سے مفاسد چھپے ہوئے ہیں، مثلاً ختنہ کی مخالفت، شریف مستورات میں بے پردگی کا رواج اور تمام احکام دینِ متین کو مٹا ڈالنا۔

مولٰینا یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ انگریزوں کی نظر میں ملک پر اُن کے ہمہ گیر تسلّط اور ان کی حکومت کے استحکام کے لیے اس ملک کے تمام باشندوں کا صرف ایک مذہب "عیسائیت" ہونا شدید ضروری ہے اور اس مذموم مقصد کے حصول کے لئے وہ نظامِ تعلیم کو تبدیل کر رہے ہیں اور جگہ جگہ اسکولوں کا جال بچھاتے چلے جا رہے ہیں[3]۔

مولٰینا کی طرح ملک کے دوسرے گوشوں میں بہت سے دردمند اور وطن دوست ہندو اور مسلمان، علما، زعما اور فوجی بھی ان

---

[1] رسالۂ غدریہ [2] ایضًا [3] رسالۂ غدریہ

حالات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے اور برطانوی سامراج کے امنڈتے ہوئے سیلاب کے خلاف جدو جہد کی تیاریاں کر رہے تھے۔ باہم ملاقاتیں ہو رہی تھیں، مشورے کیے جا رہے تھے اور پورے ملک میں بیک وقت ایک تحریک شروع کر دینے کا منصوبہ تیار ہو رہا تھا تا آں کہ اس کے لیے مئی ۱۸۵۷ء کا مہینہ طے کر لیا گیا اور بالآخر دہلی کے قریب ایک فوجی مرکز میرٹھ میں ۱۶ رمضان/۱۰ مئی کو انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی کا آغاز ہو گیا۔

مولینا کی مجاہدانہ سرگرمیاں دہلی میں

جنگِ آزادی کے آغاز کی خبر سنتے ہی مولینا معرکۂ آزادی میں شریک ہو گئے اور مسلسل ڈیڑھ سال تک ملک کے مختلف اطراف میں انگریزوں سے سرگرمِ جہاد رہے (تا آں کہ دسمبر ۱۸۵۹ء میں گرفتار کر لیے گئے)۔

مولینا نے دہلی کے مرکزِ جہاد میں بھی حصّہ لیا اور اودھ کے مرکزِ جہاد میں بھی۔ دونوں مراکز میں مولینا کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی تفاصیل ذیل میں الگ الگ پیش کی جاتی ہیں:

مولینا "سن ستاون" سے تقریبًا ایک سال پہلے سے ریاست الور میں مقیم تھے، جو دہلی سے ۸۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ دہلی ۱۸۰۳ء سے مولینا کا وطن بن چکی تھی۔ ان کا گھر، اہل دعیال

اور کتب خانہ وغیرہ دہلی ہی میں تھے۔ آغازِ جہاد[1] کے بعد مولینا نے قیامِ الور کو مستقلاً ترک کر دینے کا فیصلہ کیا اور دہلی ہی کو محور و مرکز قرار دیا۔ دہلی اور بہادر شاہ ظفر دونوں مولینا کے جانے پہچانے تھے لیکن اب نئے ماحول، موجودہ صورتِ حالات اور درپیش مسائل کے پیشِ نظر مولینا نے دہلی اور اہلِ دہلی کا جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ:

ان مسلمان اور ہندو فوجیوں نے جو انگریزوں کی فوج میں ملازم تھے اور جنھوں نے میرٹھ میں علمِ بغاوت بلند کیا اور دہلی آگئے ہیں اور ان مجاہدین نے جو جہاد کے آغاز کی خبریں سن کر جہاد کی نیت سے اطرافِ ملک سے آکر دہلی میں جمع ہو گئے ہیں، ان سب نے ضرورتاً اور مجبوراً بہادر شاہ کو دوبارہ بادشاہ بنا دیا ہے اور انگریزوں کو دہلی سے باہر دھکیل دیا ہے اور اب لال قلعہ ۱۸۰۳ء کے بعد دوبارہ آباد اور مرکزِ حکومت بن گیا ہے اور اب صورت یہ ہے کہ دہلی پر دہلی والوں کا قبضہ ہے اور انگریز دہلی سے باہر ہیں اور دہلی فتح کرنے کے

---

[1] آغاز جہاد سے فوراً پہلے مولینا الور میں تھے یا دہلی میں؟ اسکی کوئی صراحت نظر سے نہیں گزری۔ ویسے آغاز جہاد چونکہ وسطِ رمضان میں ہوا تھا اور روزہ دار عموماً اپنے اہل و عیال کے ساتھ رمضان گزارنا پسند کرتے ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ مولینا آغازِ جہاد (۱۶ رمضان) سے پہلے ہی یعنی ابتداءِ رمضان یا آخر شعبان سے دہلی آئے ہوئے ہوں۔ بہر حال آغازِ جہاد کے فوراً بعد تو یہ طے ہے کہ مولینا دہلی میں تھے۔ ہم اس پر آئندہ صفحات میں مفصل کلام کریں گے۔

لیے حملے کر رہے ہیں اور مسلسل سامانِ جنگ اور سپاہ کی تعداد میں اضافہ کر رہے ہیں، لیکن اس طرف مختلف طبقات کا جو رنگ مولینا نے دیکھا وہ یہ تھا:[1]

بادشاہ

ضعیف الرائے، غم زدہ، ناآزمودہ کار، سال خوردہ، بُرے بھلے کی تمیز سے عاری، بے اختیار، اپنی رفیقۂ حیات اور اپنے وزیر کا محکوم، وزیر نے اسے یہ یقین دلا دیا تھا کہ نصارٰی متمند ہونے کے بعد اس کے ساتھ حسنِ سلوک کریں گے اور اس کو ملک کا اقتدار منتقل کر دینگے۔

وزیر

حکومت دراصل وزیر کے ہاتھ میں ہے بادشاہ کے نہیں۔ وزیر نصارٰی کا دوست اور ان کے دشمنوں سے شدید عداوت رکھتا ہے۔

شاہزادے

بادشاہ کے افرادِ خاندان خودرائے ہیں، جو چاہتے ہیں وہی کرتے ہیں مگر بادشاہ کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں۔ انھیں نہ کبھی زندگی میں شمشیر و سناں سے واسطہ رہا، نہ میدانِ جنگ سے۔ بازاری لوگ ان کے ندیم و جلیس ہیں اور عیش و راحت، اسراف و فسق و فجور میں مبتلا ہیں۔ یہ لوگ عُسرت میں تھے۔ اس ہنگامے میں کشادہ دست ہو گئے ہیں۔ لشکر کے اخراجات کے نام پر بڑی بڑی رقمیں حاصل

---

[1] ماخوذ از رسالۂ غدریہ

کرتے ہیں اور خود ہضم کر جاتے ہیں۔ بادشاہ نے انہی میں سے ایک کو سپاہ سالار بنا دیا ہے حالاں آں کہ وہ ناعاقبت اندیش، بے عقل، خائن اور بُزدل ہے۔

فوج

میرٹھ سے آئی ہوئی باغی فوج مختلف ٹولیوں میں بٹی ہوئی ہے (۱) بعض دستے تو ایسے ہیں کہ جن کا کوئی کمان دار ہی نہیں ہے (۲) کچھ لوگوں کو میدانِ جنگ کی مشقتوں نے پست ہمت کر دیا ہے۔ (۳) کچھ لوگ قیام و طعام کی سہولتیں حاصل نہ ہونے سے ضعیف و لاغر ہو گئے ہیں۔ (۴) ایک گروہ کو ابتدا ہی میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آیا اسی کو کافی سمجھ کر بیٹھ گئے (۵) صرف ایک حصۂ فوج نصاریٰ کے سامنے صف آرا ہو کر دادِ شجاعت دے رہا ہے۔

ہندو

شہریوں میں سے ہندوؤں کا یہ حال ہے کہ پنجاب کے ہندو سرمائے سے اور افرادی طاقت سے انگریزوں کی اعانت کر رہے ہیں۔ دہلی کے ہندو باشندوں میں سے بیشتر انگریزوں کے حامی ہیں۔

مسلمان

دہلی کے مسلمانوں میں سے ایک گروہ انگریزوں کا مخالف اور دشمن ہے، مگر دوسرا گروہ انگریزوں کی محبت میں اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ باغی لشکر کو نقصان دینے اور مجاہدین کو ذلیل و رسوا کرنے میں

کوئی کسر اٹھا کے نہیں رکھتا اور ان میں باہم پھوٹ ڈالنے میں مصروف ہے۔

دہلی اور اہلِ دہلی کے متعلق مولینا کے یہ مشاہدات و تاثرات بڑے یاس انگیز اور ہمت شکن تھے، مگر مولینا نے ایک مخلص اور فاضل معالج کی طرح عوارض اور حالات کا تجزیہ ان کے اسباب و علل کی تعیین و تشخیص کے لئے کیا تھا تاکہ ازالۂ مرض کی جد و جہد علی وجہ البصیرت کی جا سکے۔ چنانچہ مولینا نے فیصلہ کیا کہ:

(۱) شاہ ضعف رائے، شیخوخت، ناتجربہ کاری وغیرہ کی وجہ سے تحریکِ جہاد کی قیادت اور اگر اللہ نے اس تحریک کو کامیابی عطا فرمائی تو بعد میں نظامِ حکومت چلانے کا اہل نہیں ہے، اس لئے اس کو اقتدار کی علامت (SYMBOL) کے طور پر باقی رکھ کر اختیارات ایک مجلسِ منتظمہ کے سپرد کر دیئے جائیں اور اس طرح اسکی بیگم اور وزیر کی غداریوں سے بھی نجات حاصل کی جائے۔

(۲) سرمایہ کی کمی تحریکِ جہاد کی کامیابی میں سدِ راہ ہے۔ سرمایہ کے حصول کی مساعی تنظیم اور باقاعدگی سے جاری کی جائیں۔

(۳) شاہزادے صرف اس "جرم" کی سزا میں کہ وہ لال قلعے میں پیدا ہوئے ہیں خواہ مخواہ نظامِ حکومت و سیاست میں دخیل ہیں، ان کو بے دخل اور معطل کیا جانا چاہیئے ویسے اصولاً و شرعاً ان سے بھی کلیتہً مایوس ہونے کا حق نہیں ہے اس لئے ان کو پُرخطر صورت

حالات، درپیش مسائل کی پیچیدگی، مستقبل کے فرائض کی گراں باریوں کا احساس دلاکر جہاد کی مہم میں مخلصانہ شرکت کی دعوت دی جاتی رہنی چاہیئے، خصوصًا اس لئے بھی کہ دہلی کے بھولے بھالے، کم علم اور قدامت پرست باشندوں نے اب تک ان "سلاطین[1]" سے عقیدت "فسخ" نہیں کی ہے۔

(۴) فوج میں جہاد کا جذبہ بیدار کرنے کی ضرورت ہے، اسے منظم کرنا ہے، نظم کا پابند بنانا ہے، اس کی ضرورتوں ــــ راشن، اسلحہ، مناسب اور آرام دہ قیام گاہ وغیرہ کو پورا کرنے پر فوری توجہ ضروری ہے۔

(۵) تحریک کو برگیر بنانے اور پورے برِعظیم کو اس مہم میں شریک کرلینے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لئے اطرافِ ملک میں برسرِ جہاد حلقوں سے روابط پیدا کرنا اور ملک کی ریاستوں کے نوابوں اور راجاؤں سے مراسلت کرکے ان کو اس جنگ میں شرکت کی دعوت دینا اور اُن سے زر اعانت کا حصول ناگزیر ہے، خصوصًا دہلی کے قرب وجوار کی ریاستوں کی شرکت تو بہت ضروری ہے۔

(۶) ملک میں ہندوؤں کی اکثریت ہے، ان کی متعدد ریاستیں بھی ہیں۔ باغی فوج میں ان کی تعداد زیادہ ہے۔ دہلی میں شہری آبادی کی اکثریت بھی ہندوؤں پر مشتمل ہے اور عام طور پر ہندوؤں کا اندازِ فکر یہ ہے کہ اس جنگ میں اگر فتح ہوئی تو پھر وہی مسلمانوں کی سلطنت آجائے گی، ہمیں کیا ملے گا، پھر انگریزوں کے ملازمین، مخبر اور بہی خواہ

---

[1] دہلی میں شاہ زادوں کو "سلاطین" کہا جاتا تھا۔

مسلمانوں اور ہندوؤں میں افتراق انگیزی کے درپے ہیں اور کوئی نہ کوئی حیلہ ایسا ڈھونڈھ رہے ہیں کہ ہندو مسلم فساد ہو جائے تاکہ یہ تحریک ضعیف ہو جائے، اس لیے ہندو مسلم اتحاد کے جدّوجہد کی ضرورت ہے اور ایسی مستقل بنیادیں تلاش کرنے کی ضرورت ہے جن پر ہندو مسلم اتحاد استوار کیا جا سکے۔

(۷) مسلم عوام بھی اس تحریک سے بے تعلق سے ہیں، پھر باہر سے مجاہدین کی آمد کی وجہ سے اور انگریزی فوجوں سے مقابلوں اور شہری نظام کی برہمی کی وجہ سے ان کو کچھ تکالیف اور شکایات بھی ہیں ضرورت ہے کہ ان کو شرکتِ جہاد کی ترغیب دی جائے۔ اور ان کا تعاون حاصل کیا جائے۔

(۸) سب سے اہم مسئلہ رَسد کا ہے۔ ہر قدم پر سرمائے کی ضرورت ہے اور آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ شاہ کا جو وظیفہ کمپنی کی طرف سے مقرر تھا وہ بھی بند ہو گیا ہے، اس لئے شاہ اور شاہزادوں کو بھی پریشانی لاحق ہے اور وہ تحریک کو اس پریشانی کا سبب سمجھ رہے ہیں۔ مجاہدین بھی بے سروسامانی کے ہاتھوں انگریزوں سے کسی فیصلہ کُن تصادم کے قابل نہیں ہیں۔

(۹) شہر میں قیامِ امن اور حسنِ انتظام کے لئے اہل کار، قابلِ اعتماد اور تحریک کے ساتھ مخلص حکام کے انتخاب اور تقرر کا مسئلہ بھی کم اہم نہیں ہے۔ شاہ کو تو تخت نشین ہونے کے بعد کبھی اقتدار اور اختیار

ملا ہی نہیں، اس لئے انھیں انتظام کا کوئی تجربہ ہونا ہی نہیں چاہیئے۔ شہر کا انتظام ریذیڈنٹ کرتا تھا۔ اب پھر اقتدار شاہ کی طرف منتقل ہو گیا ہے اور ان کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے بدنظمی عام ہے۔

ان عزائم اور مقاصد کے ساتھ مولینا نے دہلی میں اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے بہادر شاہ سے ملے۔ بہادر شاہ سے ان کے دیرینہ مراسم تھے اور وہ اپنی ولی عہدی کے عہد سے مولینا کے فضل و کمال اور ذاتی محاسن سے متاثر تھا۔ چنانچہ جب سنہ ۱۸۳۲ء میں مولینا نے دہلی کی سررشتہ داری سے مستعفی ہو کر دہلی کا قیام ترک کیا اور ریاست جھجر تشریف لے جانے لگے تو

ولی عہد سلطنت صاحب عالم مرزا ابوظفر بہادر شاہ نے اپنا دوشالہ علامہ کو اڑھایا اور بوقتِ رخصت آبدیدہ ہو کر کہا، چونکہ آپ جانے کے لئے تیار ہیں میرے لئے بجز اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کر لوں مگر خدا علیم ہے کہ لفظِ وداع زباں پر لانا دشوار ہے۔[۱]

مولینا بہادر شاہ سے مسلسل ملاقاتیں کرتے رہے اور ان کی توجہ سر وقت کے اہم مسائل کی طرف دلاتے رہے اور ان کے حل کے سلسلے میں اپنے مخلصانہ مشورہ بھی دیتے رہے اور بہادر شاہ اس اعتماد کی بنا پر جو اسے مولینا کے اخلاص اور ان کی اصابت رائے پر تھا

---

[۱] کلیات نثر غالب ص ۱۴۸

ان مشوروں پر عمل کیا کرتے تھے، مثلاً ایک ملاقات، کی جو غالباً ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو ہوئی تفصیل حکیم احسن اللہ خاں نے اپنی یادداشتوں میں^۱ دی ہے، اس ملاقات میں جن مسائل پر گفتگو ہوئی وہ یہ ہیں :

(۱) مجاہدین کی اعانت، روپیہ اور سامان رسد سے

(۲) اہل کار حکام کا تقرر

(۳) مال گزاری کی تحصیل کا انتظام

(۴) ہمسایہ والیانِ ریاست کو جنگ میں اعانت و شرکت کی دعوت چوں کہ مجاہدین کی مالی اعانت، مال گذاری کی تحصیل اور والیان ریاست کی مالی اعانت پر موقوف تھی اس لئے حکیم صاحب کے بیان کے مطابق :-

" بادشاہ نے حکم دیا کہ مولوی صاحب کی تجویز کے مطابق والیانِ ریاست کو پروانے لکھے جائیں اور بعجلت روانہ کر دیئے جائیں"

قابلِ اعتماد اور کارداں حکام کے تقرر کے سلسلے میں مولینا نے اپنے اعزہ کی خدمات پیش کی تھیں چنانچہ دو اہم مناصب پر مولینا کے دو اعزہ مقرر کیئے گیئے :

۱۔ میموائرس آف حکیم احسن اللہ خاں ص ۲۳-۲۴ ۔ مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق، کراچی ۱۹۵۸ء

(۱) مولینا عبدالحق[1] خیرآبادی، آپ مولینا فضلِ حق کے فرزند گرامی تھے اور غدر سے پہلے الور میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ مولینا عبدُالحق گوڑگانوہ کے کلکٹر مقرر کیئے گئے۔

(۲) میر نواب[2] اسی روز (۱۲ مئی کو) دہلی کا گورنر[3] مقرر کیا گیا۔ مولینا کو بہادر شاہ کی طرف سے جو اختیارات حاصل تھے اور انتظامی امور میں جو دخل تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بہت سے حکام کا تقرر مولینا نے براہِ راست بھی کیا تھا۔ حکیم احسن اللہ کا بیان[4] ہے کہ

"مولوی فضلِ حق نے بھی کئی تحصیل داروں کو ضلع دار کی نیابت میں مقرر کیا۔"

---

1. جیون لال غدر کی صبح و شام ص۲۲۲ غدر کے گرفتار شدہ خطوط ص۱۳۱ ذکاء اللہ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ص ۶۸۷/۶۹۱

2. میر نواب مولینا کے داماد سید احمد حسین رسوا (والد مضطر خیرآبادی و بسمل خیرآبادی) کے حقیقی بھائی تھے۔ میر نواب اور رسوا دونوں سید تفضل حسین کے بیٹے تھے جو غالب اور مومن کے گہرے دوست تھے۔ سید صاحب کے نام غالب کے یہ خطوط ہیں (سید باغ دو در) مومن سے سید صاحب کے گہرے تعلقات تھے۔ انھوں نے مومن کے بیٹے احمد نصیر کو متبنیٰ کر لیا تھا۔ مومن کے کئی خطوط سید صاحب کے نام ہیں (انشاءِ مومن) مومن نے مکان کی تعمیر، باغ کی تعمیر وغیرہ پر بھی قطعات تاریخ کہے تھے اور میر نواب کی شادی (۱۸۴۵ء) پر بھی قطعہ تاریخ کہا تھا (کلیات مومن ص۱۸۹)

3. جیون لال ص۱۰۲

4. حکیم احسن اللہ خاں، بہادر شاہ کا مقدمہ ص۲۵۶ —

اس طرح لال قلعہ کے دار الانشا (سیکریٹریٹ) سے مولینا کے حکم سے پروانے جاری ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ بہادر شاہ کا پرائیویٹ سیکریٹری مکند لال اپنی ایک تحریر (مورخہ ۱۸ اگست ۱۸۵۷ء) [علہ] میں لکھتا ہے کہ بہادر شاہ کے دربارِ عام سے اپنے کمرۂ خاص میں چلے جانے کے بعد مولینا نے حسب ذیل افراد کے نام پروانے جاری کرنے کا حکم دیا:

(۱) بنام حسن بخش عرض بیگی، ضلع علی گڈھ کی آمدنی وصول کرنے کے لیئے۔

(۲) بنام فیض محمد (غالباً مولینا فیض احمد بدایونی) اسے ضلع بلند شہر اور علی گڈھ کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔

(۳) بنام ولی، دادخاں مذکورہ بالا دونوں آدمیوں کو، آمدنی وصول کرنے میں مدد دینے کے لئے۔

(۴) بنام مولوی عبدالحق، ضلع گوڑگانوہ کی مال گذاری وصول کرنے کا انتظام کیا جائے۔

مولینا نے دستور بنایا

دہلی پر انگریزوں کا کامل تسلط ۱۸۰۳ء میں شاہ عالم ثانی کے عہد میں ہوچکا تھا اور اب مغل بادشاہ برائے نام رہ گیا تھا۔ وہ خود انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا اور ہر قسم کے اختیارات سے قطعاً محروم، بے زور اور بے اثر۔ انگریز اس برائے نام شاہی کو بھی ختم کر دینا چاہتے

علہ غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط ۱۲۹ و مابعد

تھے اور وہ ایسا کر سکتے تھے، مگر خود اپنی ہی مصلحتوں کی خاطر انھوں نے ابھی تک یہ قدم نہیں اٹھایا تھا۔ اختیارات سلب کر لینے کے بعد وہ اعزازات بھی رفتہ رفتہ ختم کر دینا چاہتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ بہادر شاہ کی صرف یہ حیثیت رہ گئی تھی کہ وہ سابق فرمانرواؤں کی نسل کا ایک فرد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا دست نگر ایک معزز شہری ہے مگر سن ستاون کی جنگِ آزادی نے پھر اس کو اہمیت دے دی تھی اور تحریک مجاہدین کو چوں کہ ایک مرکزی شخصیت کی ضرورت تھی، اس لئے دہلی کی فوجی، سیاسی اور تاریخی اہمیت کی بنا پر دہلی ہی سے اس مرکزی شخصیت کا انتخاب مناسب سمجھا گیا اور اس طرح بہادر شاہ کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ ان کی حکومت کا ڈنکا پیٹ دیا گیا۔ ۱۸۰۳ء سے دہلی میں ڈنکا یوں پیٹا جاتا تھا:

"خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا"

اب ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء سے ڈنکا یوں پیٹا جانے لگا:

"خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم بادشاہ کا"

مگر یہ سب جوش اور جذبات کی باتیں تھیں۔ جوش میں افراد، جماعتیں، طبقے اور قومیں بہت سی ایسی باتیں گزرتی ہیں جن پر بعد میں پچھتانا پڑتا ہے۔ نعروں اور جے کاروں سے جوش میں آ کر جو قدم اٹھائے جاتے ہیں وہ بالعموم واپس لینا پڑتے ہیں۔ میرٹھ سے جو فوج بغاوت کر کے دہلی آئی اُسے لال قلعہ میں ڈیرے ڈالنا پڑے اور اسی رواروی

میں بہادر شاہ بھی بادشاہ بن گئے، لیکن یہ بادشاہی ایک فاتح کی سی بادشاہی تو تھی نہیں، جیسے بہادر شاہ کے بزرگوں نے ملک کو فتح کیا تھا، اِس لئے وہ اس ملک کے بادشاہ تھے۔ اب اس صورتِ حالات میں بہادر شاہ کی بادشاہی کو ثبات و دوام اُس وقت مل سکتا تھا جب کہ یہ تحریکِ جہاد فتح مندی پر منتج ہوا اور فتح مندی اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ ملک کے تمام طبقے شہری اور فوجی، عوام اور خواص تمام قومیں ہندو اور مسلمان اس جنگ میں متحد و متفق ہو کر حصہ لیں، مگر حقیقت یہ تھی کہ ہندو ریاستیں، ہندو فوجی اور ہندو عوام یہ سوچتے تھے کہ اگر ہم اِس جنگ میں جیت بھی گئے تو ہمیں کیا ملے گا؟ حکومت تو پھر مسلمانوں کی ہو جائے گی، پھر انگریزوں کے ہوا خواہ اور ہمنوا بھی ہندوؤں کو ورغلا رہے تھے اور ان کے فرقہ وارانہ جذبات مشتعل کر رہے تھے۔

اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ خود ہوش مند مسلمانوں کے خیالات بھی بہادر شاہ کی حاکمانہ صلاحیتوں کے متعلق اچھے نہیں تھے۔ شاہ زادوں کی اخلاقی کمزوریوں کے چرچے عام تھے اور وہ ان تمام صفات و محاسن سے عاری سمجھے جاتے تھے جو ایک اچھے فرمانروا میں ہونے چاہیئے۔

اِس حقیقت کو اس ہنگامی و وقتی جوش و خروش میں جس شخص نے سب سے پہلے محسوس کیا وہ مولٰینا فضلِ حق کی ذاتِ گرامی تھی۔

مولینا نے اس کا یہ حل تجویز کیا کہ آل تیمور اور خاندان گورگان کے بجائے کسی اور فرمانروا خاندان کا انتخاب کرنا اور بہادر شاہ کے بجائے کسی اور شخصیت کو مرکزیت دلانے کی کوشش کے بجائے تو بہتر یہ ہے کہ بہادر شاہ کی شاہنشاہی کو دستوری حکومت اور آئینی بادشاہت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے، جس میں بادشاہ کے اختیارات کم سے کم ہوں اور ملک کے شہریوں کو بھی حکومت میں شرکت کا موقع ملے، اس مقصد کے لیے مولینا نے ایک

"دستور العمل سلطنت"

مرتب کیا۔ مولوی ذکاء اللہ[1] نے اس دستور کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کی کوئی تفصیل نہیں دی۔ ڈاکٹر مہدی[2] حسین نے اسے ایک جمہوریت اساس دستور (A CONSTITION BASED ON PRINCI-PLES OF DEMOCRACY) لکھا ہے۔ افسوس ہے کہ غیر معمولی تاریخی اہمیت کا یہ دستور سن ستاون کے ہنگامے میں ناپید ہو گیا۔ بہرحال مولوی ذکاء اللہ نے اس کی جس واحد دفعہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ مولینا کے سیاسی تدبّر کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

"مولوی صاحب عالم متبحر مشہور تھے۔ وہ الور سے

---

[1] تاریخ عروج سلطنتِ انگلشیہ ص ۶۸۷

[2] بہادر شاہ دوم (انگریزی) ص ۱۸۲ و ص ۳۸۹

ترکِ ملازمت کرکے دہلی آئے تھے۔ انھوں نے بادشاہ
کے لئے ایک دستور العمل سلطنت لکھا تھا جس کی ایک
دفعہ یہ مشہور ہوئی تھی کہ گائے کہیں بادشاہی عملداری
میں ذبح نہ ہو"۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولٰینا کا مرتب کردہ یہ دستور مکمل یا اس کے کچھ اجزا نافذ بھی کر دیئے گئے تھے۔ چنانچہ جیون لال کا بیان ہے کہ مذکورہ بالا دفعہ ۹ رجولائی کو نافذ کر دی گئی تھی اور

"منادی کر دی گئی کہ جو شخص گائے ذبح کرے گا اُسے
توپ کے منھ سے اُڑا دیا جائے گا۔

ہندو مسلم اِتحاد کی مساعی

دستور کی یہ دفعہ اور ۹ رجولائی کا یہ اعلان ہندو مسلم اِتحاد برقرار رکھنے اور غیر ملکی غاصبوں کے خلاف اہلِ وطن کی متفقہ جدوجہد کے لئے کس قدر مفید اور ضروری تھا، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انگریزوں کے ہَوا خواہ اور آلۂ کار حکیم احسن اللہ خاں نے اس فیصلے سے شدید اختلاف کیا اور یہ ارادہ ظاہر کیا کہ میں اس مسئلے میں علمآ سے استفتا کروں گا کہ یہ حکم شرعًا جائز ہے یا نہیں؟ جیون لال لکھتا ہے کہ[2]

"بادشاہ اس مخالفت سے سخت ناراض ہوئے۔
دربار برخواست کر دیا اور حرم میں چلے گئے"۔

---

[1] غدر کی صبح و شام ص ۱۶۳ [2] ایضا ص ۱۸۹

دیکھنا یہ ہے کہ اس حکم پر کسی عالمِ دین نے کوئی اعتراض نہیں کیا اس لئے کہ علماء دیکھ رہے تھے کہ مصلحتِ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت مسلمان ہندوؤں کے ساتھ فراخ دلی اور رواداری کا مظاہرہ کریں، اعتراض ہوا تو صرف اس "حامیٔ دینِ متین" بزرگ کو ہوا جو ہر قیمت ادا کر کے ملک میں برطانوی حکومت کو مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں کا اِس فیصلے سے اختلاف انگریزوں کی پالیسی کے عین مطابق تھا۔ اس وقت انگریزوں کا فائدہ اسی میں تھا کہ ذبیحہ گاؤ کی ممانعت نہ ہونے پائے، مسلمان گائے ذبح کریں اور انگریزوں اور اُنکے حامیوں کو ہندوؤں کو بھڑکانے کا موقع مل جائے اور ہندو مسلم فسادات آزادی کی اِس جد وجہد کو کمزور کر دیں، مگر مولینا کی اصابت رائے اور سیاسی بصیرت کی جو دھاک بہادر شاہ پر بیٹھی ہوئی تھی اس کی وجہ سے یہ فیصلہ تبدیل نہیں کیا جا سکا۔ ذبیحہ گاؤ کی مخالفت کا حکم برقرار رہا اور عید الاضحیٰ کے موقع پر بھی مسلمانوں نے گائے کی قربانی نہیں کی اور انگریزوں کی یہ حسرت پوری نہیں ہوئی کہ عید کے دن (یکم اگست) ہندو مسلم فساد ہو جائے۔ چنانچہ ایک انگریز نے بڑی مایوسی کے ساتھ اپنی بیوی کو خط میں لکھا[1]

"بظاہر کل (عید کے دن) زبردست فساد کے لئے ہماری امیدیں پوری نہ ہو سکیں....." بادشاہ نے نہ صرف

---

[1] خورشید مصطفیٰ - جنگِ آزادی ص ۱۹۱

گائے بلکہ بکری تک کی قربانی کی شہر میں ممانعت کر دی ہے ....". چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ لوگ آپس میں لڑتے وہ سب ہمارے خلاف ایک متحدہ اور بھرپور حملہ کرنے کے لئے ایک ہو گئے۔"

ایک اور انگریز رابرٹ لکھتا ہے[1]

"اس خاص موقع (یکم اگست / عید الاضحیٰ) پر ہندوؤں کا لحاظ کرتے ہوئے قربانی ملتوی کر دی گئی اور اس کی جگہ فرنگیوں کو ختم کرنے کے لئے ہندو مسلمانوں کی زبردست متحدہ کوشش ہو رہی ہے۔"

ترغیب جہاد کے لئے وعظ

عامۂ مسلمین اس جد و جہد کے سلسلے میں تذبذب کا شکار رکھے۔ امت کا معمول رہا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے مواقع پر علما کی طرف دیکھتی ہے اور ان کے فیصلے اور فتوے کی بنیاد پر اقدام کرتی ہے۔ چناں چہ مولینا اور دوسرے علمائے دہلی نے اپنے فرض کو پہچانا اور مسلمانوں کو اس صورتِ حال میں شریعت غرا کے احکام سے واقف کرانے سے غافل نہیں رہے اور مساجد میں جلسے کر کے اعلان کرتے رہے کہ کفار کے حملے کی شکل میں دارالاسلام کو ــــ چاہے وہ کسی پیمانے کا ہو بچانے کی فکر و کوشش کرنا شرعاً واجب ہے چناں چہ دہلی کے اس

---

[1] خورشید مصطفیٰ ص ۱۹۲

دور کا ایک اخبار نویس جیون لال ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو یہ خبر دیتا ہے [1]

"علمائے دین نے تمام شہر کے مسلمان باشندوں کو جمع کر کے انگریزوں سے جہاد کرنے کی ترغیب دی اور کہا کہ کفار کو قتل کرنے سے اجرِ عظیم ملتا ہے۔ ہزاروں مسلمان ان کے علَم کے نیچے جمع ہو گئے۔"

اس قسم کے متعدد جلسے ان علما نے مسجدوں خصوصاً جامع مسجد میں کیئے اور ان میں مولینا فضلِ حق اپنی پُرجوش تقریروں سے مسلمانوں میں جوشِ جہاد پیدا کرتے رہے۔ چنانچہ یہی جیون لال لکھتا ہے [2]

"مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔"

سپاہ کو ترغیب جہاد

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکا ہیں۔ مولینا کا تجزیہ تھا کہ فوجیوں میں سے صرف ایک گروہ ایسا ہے جو انگریزوں سے نبرد آزما ہے، اس لیے فوجیوں کے ان باقی گروہوں جو نیم دلی سے لڑ رہے تھے یا میدانِ جنگ سے لوٹ آئے تھے، ترغیبِ جہاد کی سخت ضرورت تھی، مولینا اس سے بھی غافل نہیں تھے اور فوجیوں میں بھی ان کی تبلیغی جدّ و جہد جاری تھی۔ انگریزوں کے ایک مخبر تراب علی نے رپورٹ دی کہ [3]

---

[1] بہادر شاہ کا مقدمہ ص ۱۷۱ [2] اخبار دہلی از جیون لال ص ۲۷۳ فائل ۱۲۷

[3] اخبار دہلی، رپورٹ تراب علی مورخہ ۲۸ راگست ۱۸۵۷ء

"مولوی فضلِ حق جب سے الور سے آئے ہیں وہ فوجیوں اور شہریوں کو برطانیہ کے خلاف بھڑکانے میں مسلسل مصروف ہیں ....

مولوی فضلِ حق کی اشتعال انگیزیوں سے متاثر ہو کر شہزادے بھی میدان میں نکل آئے ہیں اور سبزی منڈی کے پُل والے محاذ پر صف آرا ہیں"

آمدنی پر توجّہ

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ غدر شروع ہوتے ہی انگریزوں نے بہادر شاہ کا وظیفہ بند کر دیا تھا۔ ایک تو اسی وظیفہ میں کام نہیں چلتا تھا اور بادشاہ اس میں اضافہ کے لئے مسلسل کوشاں تھے پھر یہ بھی بند ہو گیا تو اور بھی حالات خراب ہو گئے اور اطراف ملک سے ہزاروں مجاہدین اور فوجیوں کی آمد نے مصارف میں اضافہ کر دیا تھا۔ ادھر خزانہ بالکل خالی تھا۔ سپاہیوں کی تنخواہ دینے کے لئے بھی رقم نہیں تھی۔ سپاہی اپنی ضرورتوں سے مجبور ہو کر تقاضا کرتے تھے اور تلخی پیدا ہوتی تھی۔ ایک بار فوج کے مختلف دستوں میں باہم جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ایک مرحلے پر بادشاہ نے اپنی بیویوں کا زیور پیش کیا کہ اس کو فروخت کر کے اخراجات پورے کئے جائیں۔

ان حالات میں تحریک کی کامیابی کے امکانات کا دھندلا جانا لازمی ہے۔ مولٰینا نے اس اہم مسئلے پر پہلے دن سے توجّہ دی اور

بہادر شاہ سے اپنی پہلی ملاقات میں اس پر زور دیا کہ مجاہدین کی روپیہ اور سامانِ رسد سے مدد کرنا نہایت ضروری ہے[1]۔ حکیم احسن اللہ خاں نے لکھا ہے کہ[2]

"مولوی صاحب جب کبھی بادشاہ سے ملتے وہ بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جنگ کے سلسلے میں رعایا کی ہمت افزائی کریں اور ان کے باہر (محاذ پر) نکلیں اور دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں"

اس سلسلے میں مولانا نے بہادر شاہ کے سامنے یہ دو تجویزیں رکھیں:

(۱) دور اور قریب کے تمام والیانِ ریاست سے زرِ اعانت کا مطالبہ کیا جائے۔

(۲) زرمال گزاری کی تحصیل کے لئے موجودہ نااہل ملازمین کی جگہ موزوں اور کاردان افراد کا تقرر کیا جائے۔

بادشاہ نے پہلی تجویز کو منظور کر کے والیانِ ریاست کے نام خطوط روانہ کئے جائیں۔ چنانچہ جھجر، بلب گڈھ، فرخ نگر، بریلی، جے پور، الور، جودھپور، بیکانیر، گوالیار، جیسلمیر، پٹیالہ کے فرمانرواؤں کو خطوط لکھے گئے۔

دوسری تجویز کے سلسلے میں مولانا ہی کے نامزد کردہ چند قابلِ اعتماد افراد کا تقرر کیا گیا، مثلاً مولانا ہی کے فرزند گرامی مولانا عبدالحق

---

[1] میموائرس ص۲۳ [2] ایضاً ص۲۴

کا گوڑ گانوہ کے کلکٹر کی حیثیت سے تقرر کیا گیا اور وہ ۱۹ اگست کو گوڑ گانوہ روانہ ہوئے۔ بادشاہ کی طرف سے جو اختیارات حاصل تھے ان کی بنا پر مولانا نے اپنے قلم سے بھی چند تقرر کئے تھے اور [۲]

"کئی تحصیل داروں کو ضلع دار کی نیابت میں مقرر کیا تھا"

حسن بخش عرض بیگی کو ضلع علی گڈھ کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مقرر کیا [۳] مولانا فیض احمد بدایونی کو ضلع بلند شہر کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مقرر کیا [۴]

مولانا کے ایک عزیز میر نواب (جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں) میر فتح علی کے ساتھ گورنر گوڑ گانوہ اور گڑھی پر سرو سے چالیس ہزار روپیہ لائے [۵]

مولانا نے فوجیں لڑائیں

مولانا کی مجاہدانہ سرگرمیاں صرف مشوروں، ہدایات، منصوبہ بندی، فکری قیادت اور انتظامی امور و معاملات میں شرکت تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اس جہاد میں عملی شرکت اور محاذ آرائی تک کا سراغ ملتا ہے۔ ڈاکٹر مہدی حسین لکھتے ہیں [۶]

"اگر جیون لال کے بیان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے تو مولوی

---

[۱] جیون لال ص ۲۲۲، [۲] بہادر شاہ کا مقدمہ ص ۲۵۷، [۳] غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط ص ۱۲۹، [۴] ایضاً ص ۱۲۹، [۵] نصرت نامۂ گورنمنٹ ص ۲۲،
[۶] بہادر شاہ دوم ص ۳۹۱

فضلِ حق نے شاہی فوج کی کمان بھی کی ہے۔"

کِنگ کونسل کی رکنیت

سیّد مبارک شاہ (جو دورانِ غدر دہلی کا کوتوال رہا تھا) کا بیان ہے کہ شاہ نے

(۱) جنرل بخت خاں

(۲) مولوی سرفراز علی اور

(۳) مولوی فضلِ حق

پر مشتمل ایک کنگ کونسل تشکیل دی تھی، مبارک شاہ ہی نے ایک جگہ اس کو پریوی کونسل بھی لکھا ہے[1]

ایڈمنسٹریشن کورٹ

جیسا کہ ہم پہلے تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں مولینا نے حالات کی رو کو دیکھ کر اور غالباً دہلی میں رہنے کی وجہ سے یورپ میں ملوکیت کے بجائے جمہوریت کے رواج کی (مجملاً ہی سہی) اطلاعات سے متاثر ہو کر ملک کے نظامِ حکومت کے لئے ایک دستور ترتیب دیا تھا اور اس طرح بے آئین شاہی اور مطلق العنان ملوکیت کو دستور کا پابند کر کے جمہوری طرزِ حکومت کی طرف اقدام کیا تھا تاکہ شہریوں کو بھی حکومت میں شرکت کا موقع ملے اور صرف مسلمان ہی نہیں دُوسری اقوام بھی اِس شرکت سے مطمئن ہو کر استخلاصِ وطن کی اِس جدّ و جہد

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر سیّد معین الحق دی گریٹ ریولیوشن آف ۱۸۵۷ء ص ۱۲۸ و ص ۱۸۳

(غدر) میں کھلے دل سے حصّہ لیں۔

۱۹ ویں صدی کے عین وسط میں ہمارے ملک میں لال قلعہ کی دیواروں کے سائے میں بیٹھ کر بہادر شاہ کی ناک کے نیچے آئینی حکومت کی بات کرنا، شاہ کو دستور کا پابند بنانا، عوام کو حکومت میں شریک کرنے کے لئے آواز اٹھانا جس روشن خیالی، دور اندیشی، انقلاباتِ عالم سے باخبری اور حُسنِ تدبّر کا آئینہ ہے اس کے پیشِ نظر یہ کہنا پڑتا ہے کہ مولینا فضلِ حق صرف ایک یگانۂ عصر مصنّف و مدرّس ہی نہیں تھے، بلکہ وہ سیاست مدنیہ اور تدبیر مملکت میں بھی اِس درجے کا عبور رکھتے جس طرح دوسری انواع حکمت پر اور اس طرح وہ تاریخ ملّت میں نظام الملک طوسی اور شاہ ولی اللہ جیسے ماہرین سیاست و مدنیت کے ساتھ محسُوب علمائے دین میں سے تھے اور ان کا یہ "دستور العمل سلطنت" "سیاست نامہ" اور "البدور البازغہ" کی سی اہمیت اور قدر و قیمت کا حامل تھا، افسوس یہ ہے کہ ہم اس دستور العمل کے تحفظ سے قاصر رہے اور غدر کا ہنگامہ عالم آشوب دوسرے ہزار ہا نوادر کی طرح اِس کو بھی بہالے گیا۔ اس کی صرف ایک دفعہ (امتناعِ ذبیحۂ گاؤ) اور ۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو اس کے نفاذ کا ذکر اوراقِ تاریخ میں محفوظ ہے۔

اِس دستور کی بنیاد پر جو ظاہر ہے اصولی اور اساسی احکام پر مشتمل ہوگا۔ ایک مجلس منتظمہ (جلسۂ انتظام) تشکیل دی گئی اور

بقول مہدی حسین[1] اس کا ڈائرکٹر (نگراں) مولینا کو بنایا گیا۔ اِس مجلسِ انتظامیہ کے قواعد و ضوابط (بائی لاز) کا مسودہ حسنِ اتفاق سے محفوظ رہ گیا ہے۔ بھارت کے نیشنل آرکائیوز میں وہ مسودہ[2] محفوظ ہے اور اس کا عکس ہمارے پیشِ نظر ہے۔ یہ تحریر اُردو میں ہے اور اس نقطۂ نظر سے بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہے کہ اِس نوع کے اجتماعی اور دستوری مسائل پر یہ بھی غالباً پہلی اُردو تحریر ہے اور اس کے مطالعے سے سیاسی مسائل اور انجمنوں اور اداروں کے سلسلے میں اردو اصطلاحات میں عہد بہ عہد تغیرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، مثلاً اس میں مجلس کے بجائے جلسہ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے اور ووٹ کے بجائے رائے، سیکریٹری کے بجائے سِکر تر وغیرہ۔

اس مجلس کا نام اس کے بانیوں نے "ایڈمنسٹریشن کورٹ، یعنی جلسۂ انتظام ملکی و فوجی" رکھا تھا، لیکن یہ صرف کورٹ CORT اور غدر کے نیم تعلیم یافتہ مخبروں[3] کی اِملا میں KOTE لکھا گیا ہے۔ انگریز حکام اسے باغیوں کا کورٹ لکھتے ہیں۔ مرزا مغل نے "مجلسِ شوریٰ" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یہ کورٹ غالباً اگست کے آخری ہفتے میں قائم کیا گیا تھا جیسا کہ جنرل بخت خاں

---

[1] بہادر شاہ دوم ص ۱۸۲

[2] FOR POL. CONS. N.A. BOX 57 NO 539-541

[3] میوٹنی ریکارڈ جلد ۷۱۱ حصّہ ۱۱ ص ۸/۹ مطبوعہ ۱۹۱۱ء لاہور

کے مکتوب[1] (بنام مرزا مغل مورخہ ۲۴ اگست) سے واضح ہوتا ہے۔

مشہور محقق اور مورخ ڈاکٹر سید معین الحق[2] نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہی تحریر دراصل دستور العمل سلطنت مصنفہ مولانا فضل حق ہے جس کا ذکر مولوی ذکاء اللہ نے کیا ہے۔ مگر ہماری رائے میں ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے حقیقت پر مبنی نہیں ہے اور دستور کی بنیاد پر جو کورٹ ۔ اور آجکل کی اصطلاح میں اسے آپ کابینہ بھی کہہ سکتے ہیں، بنایا گیا اس کی کارروائی کے لیے جو قواعد و ضوابط مرتب کیے گئے تھے۔ یہ وہ ہیں، نہ کہ اصل دستور۔ آجکل کی زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ملک کا جو دستور مرتب کیا گیا تھا اس دستور کی روشنی میں جو کابینہ تشکیل پانا تھی، یہ اس کابینہ کے بائی لاز ہیں کہ یہ کابینہ کس طرح فیصلے کرے؟ اسکی ہیئت کیا ہو؟ وغیرہ۔ چنانچہ قواعد و ضوابط کے پہلے ہی جملے میں ہے:

"ازاں جاکہ واسطے رفع برہمی سررشتہ اور موقوفی بدانتظامی طریقہ فوجی و ملکی کے مقرر ہونا دستور العمل کا واجب اور مناسب اور واسطے عمل درآمد دستور کے اولاً معین ہونا کورٹ کا ضروری ہے اس لئے حسب ذیل قواعد لکھے جاتے ہیں:"

یعنی قیام نظم و امن کے لئے دستور کا ہونا ضروری ہے اور دستور پر

---

[1] خط نمبر ۱۳۔ گرفتار شدہ خطوط طبع دوم ۱۹۲۳ء دہلی ص ۱۰۸ ص ۱۰۹

[2] دی گریٹ ریولیوشن آف دی ۱۸۵۷۔ ص ۱۲۸ و ص ۱۸۲ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء

عملدرآمد کورٹ ہی کر سکتا ہے، اس لئے کورٹ کے قواعد منضبط کئے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ دستور نہیں بلکہ دستور کو نافذ و روبعمل کرنیوالے کورٹ کے قواعد ہیں۔

یہ کورٹ دس ارکان پر مشتمل تھا جن میں ۶ فوج کے نمائندے تھے اور ۴ شہری۔ فوج کے نمائندے تین قسم کی فوجوں، پیادہ (انفنٹری)، سوار (کیویلری) اور توپ خانہ (آرٹلری) میں سے دو دو منتخب ہوتے تھے۔ ۴ شہری ارکان کے لئے قواعد میں کوئی وضاحت نہیں ہے کہ ان کا معیار انتخاب کیا ہوگا۔ نہ مولینا کے سوا کسی اور شہری رکن کا نام کہیں نظر سے گزرا۔ انگریزوں کے مخبر تراب علی[۱] نے یکم ستمبر ۱۸۵۷ء کو "دہلی کی خفیہ خبروں" کے عنوان سے جو مراسلہ انگریز حکام کو بھیجا تھا اس میں اس کورٹ کی تشکیل کی خبر کے ساتھ کورٹ کے فوجی ارکان کی فہرست دی ہے اور آخر میں لکھا ہے:

"مولوی فضل حق بھی اس کے ایک رکن ہیں"

ممکن ہے باقی ۳ شہری ارکان کی شمولیت مختلف مصالح اور مجبوریوں کے پیشِ نظر معرضِ التوا میں پڑ گئی ہو اور غیر فوجی رکن صرف مولینا فضلِ حق ہی رہے ہوں جو اس دستور کے مصنف اور مرتب تھے جس کی بنیاد پر یہ کورٹ تشکیل دیا گیا تھا۔

اس کورٹ کے ارکان کو جو حلف اٹھانا پڑتا تھا اس سے اس

---

[۱] میوٹنی ریکارڈ جلد ۱۱ حصہ ۱۷ ۸/۹ و سیکریٹ لیٹرس ۱۹۱ مورخہ ۷ ستمبر ۱۸۵۷ء

کے دائرۂ کار، اختیارات کی وسعت اور حدود اختیارات کا بھی اندازہ ہوتا ہے، حلف یہ تھا:۔

"کام کو بڑی دیانت اور امانت سے بلا رد رعایت کمال جانفشانی سے اور غور و فکر سے سرانجام کریں گے اور کوئی دقیقہ وقائق متعلقہ انتظام سے فروگذاشت نہ کریں گے اور حیلۃً وصراحتہً اخذ اجر یا رعایت کسی طرح کسی لحاظ سے وقت تجویز امور انتظام کورٹ میں نہ کریں گے، بلکہ ہمیشہ ساعی اور سرگرم ایسے انتظام امورات سلطنت میں مصروف رہیں گے کہ جس سے استحکام ریاست اور رفاہ اور آسائش رعیت ہو اور کسی امر مجوزہ کورٹ کو بے اجازت کورٹ اور صاحب عالم[۱] قبل اجرا اس کے صراحتاً یا کنایتہً کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔

اِس حلف سے اندازہ ہوتا ہے کہ

(۱) کورٹ کی مدت کار صرف ہنگامی حالات اور زمانۂ جنگ تک محدود نہیں ہے بلکہ زمانۂ مابعد جنگ (اغیار سے استخلاص وطن) کے مسائل بھی پیشِ نظر ہیں۔

(۲) صرف دہلی اور جنگ سے متاثرہ علاقے تک اس کورٹ کا دائرۂ کار محدود نہیں ہے بلکہ سلطنت، ریاست (اسٹیٹ) جیسے

۱؎ مرزا مغل

الفاظ بتاتے ہیں کہ پورے ملک کا انتظام مقصود ہے۔

اِن قواعد میں سب سے اہم بات وہ ہے جس کی طرف ہم پہلے توجہ دلا چکے ہیں کہ اس کے ذریعے بادشاہ کو بے اختیار اور صرف آئینی سربراہ بنا دیا گیا ہے۔ دفعہ ۶ میں ہے:۔

"جو امورات انتظام کے پیش آئیں اوّل تجویز ان کی کورٹ میں ہوگی اور بعد منظوری صاحب عالم بہادر کے اطلاع رائے کورٹ سے حضور والا میں ہوتی رہے گی"

اِس طرح اصل فیصلہ کورٹ کرے گا جس کو صاحبِ عالم (مرزا مغل جو کمانڈر انچیف تھے) منظور کر کے بادشاہ کو صرف اس کی اطلاع کر دیں گے۔ دفعہ نمبر ۷ میں ہے کہ کورٹ کے ہر فیصلے کے نفاذ کے لئے صاحبِ عالم کی منظوری اور حضور والا (بادشاہ) کی اِطلاع ضروری ہی مگر جب کسی فیصلے سے صاحبِ عالم کو اتفاق نہ ہو تو وہ ———— کورٹ کو واپس کر دینگے اور کورٹ اس پر نظر ثانی کر کے پھر صاحبِ عالم کو بھیج دے مگر اب صاحبِ عالم کا کام صرف یہ ہوگا کہ وہ اس فیصلے کو حضور والا تک پہنچا دیں اور اس صورت میں حضور والا کا فیصلہ ناطق ہوگا بہادر شاہ کو اپنے اختیارات پر یہ قدغن پسند نہیں تھی اور یہی بھی نہیں چاہیے تھی اگر انھیں مستقبل کے ہولناک واقعات کا وہ اندازہ ہوتا جو مولینا فضلِ حق کو تھا تو یہ جدّ و جہد ناکام ہی کیوں ہوتی؟ چنانچہ انھوں نے گرفتار ہونے کے بعد فوجی عدالت کے سامنے جو بیان دیا تھا اس میں اس کورٹ کا بھی ذکر کیا تھا:۔

"باغی سپاہ نے ایک کورٹ قائم کیا تھا جہاں تمام معاملات
کے فیصلے ہوتے تھے اور جن معاملات کو وہاں طے کیا جاتا
تھا انھیں کو یہ کونسل اختیار کرتی تھی، لیکن میں نے ان
کی کانفرنس میں شرکت نہیں کی" [1]

ایک بار لال قلعہ کے ایک حصے میں مجاہدین کا قیام بہادر شاہ
کو گوارا اور مناسب معلوم نہ ہوا تو مرزا مغل کو لکھا کہ [2]-
"کورٹ کے ممبران سے انھیں ہٹانے کے لئے کہو"
شاہ زادگان عالی تبار کو بھی یہ دخل در معقولات بہت ناگوار تھا
چنانچہ ان کے بھی کئی شکایت نامے اوراقِ تاریخ نے "وقت ضرورت"
کام میں لانے کے لئے سینے سے لگا رکھے ہیں [3]-

---

[1] بہادر شاہ کا مقدمہ ص ۱۳۶
[2] گرفتار شدہ خطوط
[3] گرفتار شدہ خطوط ص ۸۱ و ص ۸۲

اودھ میں مولانا کی مجاہدانہ سرگرمیاں

۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء دہلی پر انگریزوں کا مکمل تسلّط ہوگیا اور نہ صرف مولانا فضل حق بلکہ دوسرے ہزاروں محبانِ وطن اور حریت پسندوں کی سرفروشانہ جدّوجہد ناکام ہوگئی اور اب ہر اُس فرد کے لئے جس نے کسی پیمانے پر بھی اِس جدّوجہد میں حصّہ لیا تھا دہلی میں قیام دشوار بھی ہوگیا اور خطرناک بھی۔ مجاہدین نے یہ منصوبہ بنایا کہ بہادر شاہ کو لے کر دہلی سے نکل جائیں اور اب دہلی کے بجائے لکھنؤ کو میدانِ جنگ بنائیں اور وہاں انگریزوں سے مقابلہ کریں، مگر بہادر شاہ تو انگریزوں کے ہوا خواہ مشیروں کی رائے سے متاثر ہوکر اور اپنی پست ہمتی اور بدقسمتی کی وجہ سے مجاہدین کا مزید ساتھ دینے سے معذور رہے اور لال قلعہ خالی کر کے ہمایوں کے مقبرے چلے گئے۔ بہادر شاہ کے برعکس مولانا فضل حق، جنرل بخت خاں وغیرہ باقی تمام مجاہدین نے ہمّت نہیں ہاری۔ اُن کے نزدیک محاذ دہلی پر شکست، ہر محاذ پر شکست

کے مترادف نہیں تھی، اُن کے عزائم ابھی بلند تھے۔ چنانچہ ان حضرات نے دہلی سے نکل کر یوپی کا رُخ کیا، جہاں ابھی میدانِ کارزار گرم تھا اور بریلی، مراد آباد، لکھنؤ وغیرہ متعدّد محاذوں پر مجاہدینِ وطن فرنگی عساکر سے سرگرمِ جنگ اور مقابلہ آرا تھے۔

مولینا فضلِ حق ۲۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بھرا پُرا گھر، بیش قیمت اسباب اور سب سے بڑھ کر لعل و گوہر سے سِوا قیمتی نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ چھوڑ کر صرف اپنی اور اہل و عیال کی جانیں لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ راستے پُرخطر تھے اور مواصلات کا نظم درہم و برہم تھا۔ بڑی دشواریوں کے بعد نومبر ۱۸۵۷ء میں وطن مالوف خیرآباد (ضلع سیتاپور) پہنچ سکے۔ وطن پہنچ کر یوپی میں برپا جنگِ آزادی کے مختلف محاذوں کا جائزہ لیا اور بالآخر حضرت[۱] محل کے ساتھ تعاون کا فیصلہ کیا۔

۱؎ غدر سے ایک سال پہلے ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اودھ کے حکمراں واجد علی شاہ کو معزول کر دیا تھا اور وہ اس وقت مٹیا برج (کلکتہ) میں نظر بند تھے۔ سن ستاون کی جنگِ آزادی برپا ہونے پر محبانِ وطن نے واجد علی شاہ کے کم سن صاحبزادے مرزا برجیس قدر کو واجد علی شاہ کا جانشین قرار دے کر تخت نشین کیا اور بہادر شاہ سے اس کی منظوری بھی حاصل کر لی اور پھر اُن کی قیادت میں انگریزوں سے مقابلہ کا اعلان و آغاز کر دیا۔ مرزا برجیس قدر کم سن تھے، اس لئے اصل قیادت انکی والدہ ملکہ عالیہ بیگم حضرت محل کر رہی تھیں۔ بیگم نے تقریبًا ۱½ سال انگریزوں سے مردانہ وار مقابلہ کیا اور دسمبر ۱۸۵۸ء میں ناکام ہو کر نیپال چلی گئیں، جہاں ۱۸۷۴ء میں وفات پائی۔

مولینا نے بیگم حضرت محل کے ساتھ تعاون کا آغاز غالبًا مارچ ۱۸۵۸ء میں کیا۔ بیگم نے انگریزوں سے مقابلہ کا آغاز چن ہٹ (لکھنؤ سے ۸ میل دور ایک مقام) سے ۳۰ جولائی ۱۸۵۷ء کو کیا تھا اور تقریبًا ایک لاکھ ساٹھ ہزار انگریز فوج کے سپاہیوں سے جنگ کی تھی۔ اس کے بعد سات ماہ تک لکھنؤ میں معرکہ گرم رہا اور جنرل بخت خان اور شاہزادہ فیروز شاہ اور مولوی احمداللہ شاہ بھی بیگم کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ مارچ ۱۸۵۸ء میں بیگم اور مجاہدین لکھنؤ خالی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بیگم لکھنؤ سے نکل کر سیتاپور پہنچیں اور یہیں غالبًا مولینا فضل حق بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور یہ قافلہ سخت جان سیتاپور سے بونڈی (ضلع بہرائچ) پہنچا۔ اس عرصے میں انگریز روہیل کھنڈ کی مہم سے فارغ ہو چکے تھے اور خان بہادر خاں وغیرہ کی طرف سے مطمئن ہو کر ایک بڑی —— ایک لاکھ سے زیادہ فوج لے کر بونڈی پہنچے اور یہاں مجاہدینِ وطن اور انگریزوں کے درمیان ایک فیصلہ کن اور آخری معرکہ ہوا۔

بیگم کی فوج مولینا کی مدبّرانہ اور قائدانہ صلاحیتوں سے مسلسل مستفید ہوتی رہی اور مجاہدین کی مجلسِ شوریٰ کے جسے "اربابِ شوریٰ" بھی کہا جاتا تھا اور "پارلیمنٹ" بھی، مولینا ایک ممتاز اور خصوصی رکن تھے۔ بیگم کے وزیر ممو خاں سے مولینا کا خصوصی ربط و قرب رہا اور مولینا کو ممو خاں کا مشیر سمجھا جاتا تھا۔ ممو خاں مولینا کے

ساتھ اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آتے تھے اور اکثر مولینا کی قیام گاہ پر آتے رہتے تھے۔

اِس جنگِ آزادی میں اہلِ وطن کی ناکامی مقدر ہو چکی تھی اور وہ تمام اسباب و عوامل مفقود تھے جو کامیابی کے لئے ناگزیر ہیں۔ مجاہدین میں باہم انتشار و تشتت، قائدین فوج میں باہم اعتماد کا فقدان اور مشترکہ دشمن کے خلاف اتحاد و اتفاق کے بجائے آپس ہی میں بار بار تفرقہ پیدا ہوتا رہا۔ چنانچہ پہلے تو مولوی احمداللہ شاہ اور بیگم کی فوج میں اختلافات پیدا ہوئے اور ان کے نتیجے میں مجاہدین کے ان دونوں گروپوں میں باہم جنگ ہوگئی اور بہت سے مجاہدین اس آپس کی جنگ میں شہید ہو گئے۔ اِسی طرح فیروز شاہ اور مولوی احمداللہ شاہ میں بھی باہم اختلاف ہو گیا تھا اور دونوں اپنی اپنی فوجوں کو لے کر متفرق ہو گئے تھے۔ مولوی احمداللہ شاہ نے محمدی پر قبضہ کرکے حکومت قائم کر لی تھی اور فیروز شاہ دوسرے مقامات پر انگریزوں سے نبرد آزما رہا۔ دسمبر ۱۸۵۸ء کے ایک سرکاری مراسلے سے پتہ چلتا ہے کہ مولینا اس عرصے میں فیروز شاہ کے ساتھ تھے، بلکہ گرفتاری کے بعد مقدمہ میں جو فرد جرم مولینا پر عائد کی گئی تھی اس کی رُو سے تو ایک باغی فوج کی کمان خود مولینا کر رہے تھے۔

بہر حال اس وقت فتح و نصرت ہمارے لئے مقدر نہیں تھی۔

یہ جنگ ناکامی پر منتج ہوئی بیگم حضرت اور مرزا برجیس نے نیپال میں پناہ لی، فیروز شاہ اور ڈاکٹر وزیر خاں نے حجاز کی راہ لی۔ جنرل بخت خاں نے سرحد کا رُخ کیا، مولوی احمد اللہ شہید کر دیئے گئے تھے اور جو مجاہدین بچ گئے تھے وہ متحیّر تھے کہ کیا کریں؟

انگریز جب ہر محاذ پر جیت چکے تو نومبر ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کا اعلان معافی شائع کیا گیا جس میں ۳۰ دسمبر ۱۸۵۸ء تک کی مہلت دی گئی تھی۔

مولینا رفقائے جہاد کے منتشر ہو جانے کے بعد استخلاص وطن سے مایوس اور مستقبل کے سلسلے میں متحیر تھے کہ یہ اعلان معافی نظر سے گزرا اور وہ اس پر اعتماد کر کے اپنے گھر خیرآباد آگئے۔

گرفتاری

خیرآباد پہنچ کر مولینا ۲۶ دسمبر کو کرنل کلارک سے ملے۔ کرنل نے انھیں ڈپٹی کمشنر کی تحویل میں دیئے جانے کا حکم دیا۔ ۳۰ دسمبر کو مولینا ڈپٹی کمشنر سے مل کر اپنے گھر میں مقیم اور گویا نظر بند رہے۔

۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو انھیں گرفتار کر کے لکھنؤ روانہ کر دیا گیا۔ ۲۲ فروری کو مقدمہ پیش ہوا اور ۲۸ فروری کو حسب ذیل فردِ جرم عائد کی گئی:

● — "وہ ۱۹۵۷ اور ۱۹۵۸ء کے دوران بغاوت کا سرغنہ رہا اور دہلی اور اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور

قتل کی ترغیب دی۔"

"اس نے بوندی کے مقام پر مئی ۱۸۵۸ء میں باغی سرغنے ممو خاں کی مجلسِ مشاورت میں نمایاں حصّہ لیا۔"

مقدمے کی سماعت کے بعد ۴ مارچ ۱۸۵۹ء کو حبس دوام بعبور دریائے شور اور تمام جائداد کی ضبطی کا فیصلہ سُنایا گیا۔ مولٰینا نے وائسرائے کے یہاں اپیل کی، مگر وہ بھی مسترد ہوگئی اور مئی ۱۸۵۹ء میں مولٰینا کو لکھنؤ سے کلکتے روانہ کردیا گیا اور وہاں سے ۸ اکتوبر کو انڈمان لے جائے گئے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے ۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو ایک درخواست وزیر ہند کے نام روانہ کی۔ ادھر مولٰینا کے صاحبزادے[1] نے بھی اپنی طرف سے ایک اپیل کی جس کے جواب میں بقول ذکاءُ اللہ[2] رہائی کا حکم ہوا، مگر رہائی کا حکم نافذ ہونے سے قبل ہی ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۲۰ اگست ۱۸۶۱ء کو اس امام معقول اور مجاہد حریت نے انڈمان ہی میں وفات پائی۔

مولٰینا کی تمام جائداد بھی ضبط کرلی گئی، جس میں دیوان خانہ، محل سرا اور کئی دیہات[3] اور مجموعۂ نوادرِ کتب خانہ[4] بھی تھا۔

---

[1] "چنانچہ تم کو معلوم ہوجائے گا کہ ان کا بیٹا عدالت میں اپیل کیا چاہتا ہے"۔ (مکتوب غالب بنام یوسف مرزا اردوئے معلّی) [2] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ص ۶۸۸

[3] ان میں سے دو کے نام موضع زین پورہ اور موضع نندو پورہ

[4] "اس غدار عالم دین کا کتب خانہ جس کو حکومت نے ضبط کیا

انڈمان ہی میں مولینا نے قصائد[۵] فتنۃ الہند (ہمزیہ و دالیہ) اور رسالہ غدریہ[۶] تالیف فرمائے۔

تھا کلکتہ کالج میں موجود ہے" ولیم ہنٹر (ہمارے ہندوستانی مسلمان)

ع[۵] ان میں سے ہمزیہ کے تین شعر پہلی بار ۱۹۰۷ء میں مولینا سید برکات احمدؒ نے "حسرۃ العلما" میں نقل فرمائے تھے۔

ع[۶] اس رسالے کا ذکر پہلی بار ۱۸۷۳ء میں امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں کیا تھا اور رسالے کا نام "تاریخ احوال غدر" لکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ نام انھیں مولینا عبدالحق خیرآبادی نے بتایا ہوگا۔ اس کا نام "الثورۃ الہندیہ" مولینا آزاد نے تجویز کیا تھا۔

(تقریظ باغی ہندوستان)

مولٰینا اور فتوائے جہاد

مولٰینا فضلِ حق نے " اٹھارہ سو ستاون " کے جہادِ حریت میں جس جس پہلو سے اور جتنا حصّہ لیا تھا ہم اس کی تفاصیل مثبت انداز میں آپ کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ اب ہم ان شبہات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو مولٰینا کی شرکتِ جہاد پر کیے گئے ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر مولٰینا امتیاز علی خاں عرشی (تحریک دہلی، اگست ۱۸۵۷ء) اور جناب مالک رام (تحریک دہلی جون ۱۹۶۰ء) کے مضامین ہیں۔ اِن مضامین میں اِن دونوں حضرات نے عہدِ ماضی وحال کے بعض مورخین کی تحریروں پر گرفت کرتے ہوئے کئی مسائل چھیڑے ہیں مگر خصوصیت سے جن دو سوالات سے مجھے اِس وقت بحث کرنا ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) مولٰینا نے اس معرکۂ جہاد میں کوئی فتویٰ نہیں دیا تھا؟

(۲) مولٰینا اگست میں دہلی پہنچے تھے ؟

فتویٰ

جہاں تک اس کا سوال ہے کہ مولینا نے دورانِ جہاد کوئی فتوےٰ دیا تھا یا نہیں تو مولینا عرشی نے لکھا ہے کہ مولینا فضلِ حق خیرآبادی کا جہاد کے فتوے سے کوئی تعلق نہ تھا اور تاریخ عروج سلطنتِ انگلشیہ مؤلفہ مولوی ذکاء اللہ کا اقتباس نقل کرکے بتایا ہے کہ جنرل بخت خاں نے اپنے ورود دہلی (۲ جولائی ۱۸۵۷ء) کے بعد علما سے جو فتویٰ حاصل کیا تھا اور جو پہلے اخبار الظفر دہلی اور پھر اس کے حوالے سے صادق الاخبار دہلی کی ۲۶ جولائی کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اس پر دستخط کرنے والے علما میں مولینا فضلِ حق نہیں ہیں۔ یہی بات مالک رام صاحب نے لکھی ہے کہ

"جس فتوے میں اُن کی شمولیت پر اصرار (؟) کیا جاتا ہے وہ ان کے آنے سے بہت پہلے جولائی ہی میں شائع ہو چکا تھا اس لئے اِس پر اُن کے دستخط کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یقیناً انھوں نے ایسا کوئی فتویٰ نہیں دیا تھا جس میں جہاد کی ترغیب دی گئی ہو۔"

اس سلسلے میں پہلے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ صادق الاخبار میں جو فتویٰ شائع ہوا تھا کیا یہ وہی فتویٰ تھا جو بخت خاں نے حاصل کیا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ وہ فتویٰ نہیں تھا کیوں کہ

(۱) بخت خاں نے جو فتویٰ حاصل کیا تھا ذکاء اللہ ہی کے

مطابق اس میں لکھا تھا کہ " مسلمانوں پر جہاد اس لئے فرض ہے کہ اگر کافروں کو فتح ہو گئی تو وہ ان کے سب بیوی بچوں کو قتل کر ڈالینگے"۔ (ص ۶۷۹) اور صادق الاخبار کے فتوے میں جو صادق الاخبار کے عکس سے عرشی صاحب نے اپنے مضمون میں مکمل نقل کیا ہے یہ الفاظ ہیں نہ ان سے ملتے جلتے الفاظ اور نہ ان کا مفہوم اور نہ یہ نکتہ :

(۲) ذکاءُ اللہ نے لکھا ہے کہ " مولوی محبوب علی اور خواجہ ضیاءُ الدین نے فتوے پر مہریں نہیں کیں"۔ مگر اس فتوے پر پانچویں نمبر مولوی محبوب علی کے اور سولہویں نمبر پر خواجہ ضیاءُ الدین کے دستخط موجود ہیں۔

اس لیے ہم بجا طور پر یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ بخت خاں نے جو فتویٰ حاصل کیا تھا وہ دوسرا تھا اور یہ دوسرا ہے۔ دراصل تحریکِ آزادی کے دَوران ایک نہیں کئی فتوے حاصل کیے گئے تھے :

(۱) ایک تو وہ فتویٰ تھا جسے سرسیّد نے "پہلا فتویٰ" کہا ہے اور جس میں جہاد کے عدم وجوب کا حکم بیان کیا گیا تھا۔

(۲) دوسرے فتوے کا ذکر ذکاءُ اللہ نے ہی کیا ہے :۔

" ایک شخص نے اپنا فرضی نام محمدؐ صادق لکھ کے جامع مسجد کے اندر دیواروں پر ایک اشتہار چسپاں کیا جس کے اوپر تلوار اور سپر کی بھدّی سی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس کے مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ ایران کی سپاہ

انگریزوں کے پنجے سے ہندوستان کو چھڑانے آئی ہے۔ سب مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ جہاد کے لئے مستعد ہوں۔" ص ۳۸۶

اس اشتہار کے اثرات کے متعلق بہادر شاہ کے مقدمے میں ایک گواہ بتاتا ہے کہ[1]

"اس اشتہار کو دیکھ کر دہلی کے پانچ سے زیادہ مسلمانوں نے جہاد پر آمادگی ظاہر کی تھی اور یہ بھی بتایا ہے کہ ماہ مئی میں غدر سے چند روز قبل یہ اشتہار چسپاں ہوا تھا۔

(۳) اس سلسلے میں ذکاءُ اللہ کے یہ الفاظ بھی توجہ کے مستحق ہیں، کہ "جب تک دہلی میں بخت خاں نہیں آیا تھا۔ جہاد کے فتوے کا چرچا شہر میں بہت کم تھا۔ اور مساجد میں ممبروں (منبروں) پر جہاد کا وعظ کم تر ہوتا تھا" ص ۶۷۶

گویا بخت خاں سے پہلے شہر میں جہاد کے فتوے کا چرچا تھا مگر بہت کم تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سا فتویٰ تھا جس کا چرچا رہبت کم ہی سہی، مگر تھا؟ جب "لوگ جہاد جہاد پکارتے تھے" اور مساجد میں منبروں پر جہاد کا وعظ (کم تر ہی سہی) ہوتا تھا تو اسی بنیاد پر ہوتا ہوگا نا کہ جہاد کی فرضیت کا فتویٰ ہو چکا ہے؟

اب آپ بخت خاں والے فتوے کے الفاظ اور مولٰنا فضلِ حق

---

[1] بہادر شاہ کا مقدمہ (مرتبہ خواجہ حسن نظامی) ص ۵۷، دہلی ۱۹۲۳ء

کے اس ارشاد میں لفظی و معنوی قرب و تطابق ملاحظہ فرمائیں جو انھوں نے بہادر شاہ سے فرمائے تھے۔ بخت خاں نے جو فتویٰ حاصل کیا تھا اس کے الفاظ تھے:

"اگر کافروں کو فتح ہوئی تو وہ ان کے سب بیوی بچّوں کو قتل کر ڈالیں گے۔"

اور مولینا فضل حق نے بہادر شاہ کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ[1]

"اگر انگریز جیت گئے تو نہ صرف خاندانِ تیموریہ بلکہ سب مسلمان نیست و نابود کر دیئے جائیں گے۔"

مولینا کا ورود دہلی

اسی فتویٰ جہاد میں مولینا کی شرکت کے سلسلے میں یہ سوال بھی اٹھایا گیا تھا کہ مولینا دہلی کب تشریف لائے؟ بات یوں نکلی کہ مولوی ذکاء اللہ نے اپنی کتاب تاریخ عروجِ سلطنتِ انگلشیہ میں لکھا تھا کہ

"جب تک بخت خاں دہلی میں نہیں آیا تھا جہاد کے فتوے کا چرچا شہر میں بہت کم تھا... مگر جب بخت خاں دلی میں آیا تھا تو اس نے یہ فتویٰ لکھایا کہ مسلمانوں پر جہاد اس لئے فرض ہے کہ اگر کافروں کو فتح ہو گی تو وہ ان کے سب بیوی بچّوں کو قتل کر ڈالیں گے۔" (ص ۶۷۶)

---

[1] حکیم احسن اللہ خاں کی یادداشتیں (انگریزی) مرتبہ ڈاکٹر معین الحق کراچی ۱۹۵۸ء ص ۲۳

اس کے بعد ایک کتاب "سوتنتر دہلی" ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی جس میں صادق الاخبار دہلی کی ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں شائع شدہ ایک استفتا اور فتویٰ کا عکس طبع ہوا تھا، اس پر عرشی صاحب نے قیاس کر لیا ہے کہ دورانِ جہاد صرف ایک ہی فتویٰ جاری ہوا تھا اور یہ عکس اسی فتوے کا ہے حالاں کہ

(۱) ذکاءُ اللہ ہی کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ بخت خاں کے دہلی آنے سے پہلے بھی دہلی میں فتوے کا چرچا تھا، اگرچہ بہت کم تھا۔

(۲) ذکاءُ اللہ نے بخت خاں کے حاصل کردہ فتوے کے جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ اس فتوے میں نہیں پائے جاتے۔

بہرحال عرشی صاحب نے یہ فرض کر لیا کہ ذکاءُ اللہ نے جس فتوے کا ذکر کیا ہے وہ یہی فتویٰ تھا اور اس پر دستخط کرنے والے علما میں مولینا فضل حق شامل نہیں ہیں، اس لئے مولینا خیرآبادی کا جہاد کے فتوے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

مولینا فضل حق کے فتوے میں شامل نہ ہونے کی دوسری دلیل عرشی صاحب نے یہ دی ہے کہ یہ فتویٰ ۲۶ جولائی سے پہلے مرتب ہوا تھا اور جیون لال کے بیان[۱] کے مطابق مولینا ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء کو شریکِ دربار (بہادر شاہ) ہوئے تھے۔ گویا یہ فتویٰ مولینا کے ورودِ دہلی سے پہلے مرتب ہو کر شائع ہو چکا تھا، اس لئے

---

[۱] غدر کے صبح و شام ص۲۱ دہلی ۱۹۲۶ء۔ مرتبہ خواجہ حسن نظامی

اس پر مولینا خیرآبادی کے دستخط ہو ہی نہیں سکتے۔

عرشی صاحب کی اس تحلیل کی تائید مالک رام صاحب نے فرمائی اور لکھا:

"جس فتوے میں اس شمولیت پر اصرار (؟) کیا جاتا ہے
وہ آنے سے بہت پہلے جولائی ہی میں شائع ہو گیا تھا،
اس لیے اس پر ان کے دستخط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...
یقیناً انھوں نے ایسا کوئی فتویٰ نہیں دیا تھا جس میں
جہاد کی ترغیب دی گئی ہو"

مختصر یہ کہ مولینا فضلِ حق کے فتوائے جہاد میں عدم شرکت کے دو دلائل ان حضرات نے دیئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ صادق الاخبار میں شائع شدہ فتوے پر جسے ان حضرات نے بخت خاں والا فتویٰ فرض کیا ہے مولینا فضل حق کے دستخط نہیں ہیں۔ اس دلیل کے بارے میں ہم گذشتہ سطور میں وضاحت کر چکے ہیں۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ یہی صادق الاخبار میں شائع شدہ فتویٰ ۲۶ جولائی سے پہلے حاصل کیا گیا تھا اور مولینا ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء کو دہلی پہنچے تھے۔ ۱۶ اگست کو دہلی پہنچنے کا ثبوت عرشی صاحب نے یہ دیا ہے کہ "مولینا شروانی (عبدالشاہد خاں، مصنف باغی ہندوستان) نے اپنی کتاب میں منشی جیون لال کے روزنامچے سے نقل کیا ہے کہ ۱۶ اگست کو مولینا خیرآبادی شریکِ دربار ہوئے"

اِس سلسلے میں گذارش ہے کہ عرشی صاحب جیسے محقق سے یہ اندازِ استدلال ہمارے لئے غیر متوقع ہے۔ کسی بھی بات کی ایسی تحقیق کہ قائل دماغ طب کی کسی کوتاہی، لغزش یا غلطی کو سند بنا کر بات کی تردید کر دی جائے "تحقیق" نہیں کہی جاسکتی۔ اس طرح قائل کی تردید و تنقید کا حق چاہے ادا ہو جاتا ہو مگر نفس مسئلے کی تحقیق کا حق ادا نہیں ہو سکتا، قائل کے سہو و خطا کی نشان دہی چاہے ہو جائے مگر اس اندازِ استدلال سے تحقیق کا حق ادا اور مسئلے کے ساتھ، انصاف نہیں ہو سکتا۔ زیرِ نظر مسئلے کی تحقیق کی ایک صورت تو یہ تھی جو عرشی صاحب نے اختیار فرمائی کہ چونکہ مولانا شروانی نے مولینا فضلِ حق کے ورود دہلی کی تاریخ بحوالہ جیون لال ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء متعین کی ہے اور فتوے اس سے پہلے مرتب ہو چکا تھا اس لئے مولینا فضلِ حق کی اس فتوے میں شمولیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری صورت یہ تھی اور ہم عرشی صاحب جیسے نامور محقق سے اس کے متوقع تھے کہ وہ خود ادبیات غدر کا مطالعہ کر کے یہ طے فرماتے کہ مولینا فضلِ حق کب دہلی تشریف لائے تھے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اگر عرشی صاحب اِس طرح سعی فرماتے تو یقیناً وہ یہ فیصلہ کر سکتے تھے کہ مولینا اس سے قبل بھی دہلی میں تھے یا الور سے دہلی (جن میں صرف اسّی میل کا فاصلہ ہے) آتے جاتے رہتے تھے۔

بہر حال اس سلسلے میں ہمارا حاصلِ فکر و مطالعہ یہ ہے کہ

کہ مولینا آغازِ جہاد یعنی مئی ۱۸۵۷ء ہی سے دہلی میں تھے۔ دہلی ان کا وطن و مسکن تھا۔ ان کے غالب، ان کے آزردہ اور ان کے اہل و عیال بھی یہیں تھے۔ پھر غدر کا آغاز ۱۷ رمضان میں ہوا تھا اور رمضان عموماً ہر روزہ دار اپنے اہل و عیال میں گذارتا ہے۔ ۲۵ مئی کو عید الفطر تھی۔ عید پر مسافر ضرور اہل و عیال سے آملتا ہے۔ مختصراً یہ کہ عقلاً ان کا اس زمانے میں دہلی میں ہونا مستبعد اور خلافِ قیاس نہیں، قرینِ قیاس ہے۔

جیون لال کے یہ لکھ دینے سے کہ وہ ۱۶ اگست کو بہادر شاہ سے ملے تھے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ اس تاریخ سے پہلے دہلی میں نہیں تھے؟ اور یہ کیا ضروری ہے کہ مولینا جب بھی دربار میں آئے ہوں جیون لال ضرور لکھے، مثلاً ۱۹ اگست کو بھی عبداللطیف کے بیان کے مطابق مولینا بادشاہ سے ملے تھے۔ (غدر کا تاریخی روزنامچہ از خلیق احمد نظامی) مگر جیون لال کا روزنامچہ خالی ہے۔ اگر جیون لال کے ان الفاظ سے کہ "مولوی فضلِ حق شریکِ دربار ہوئے اور انھوں نے ایک اشرفی نذر کی" یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ یہ پہلی بار شریکِ دربار ہونے کا ثبوت ہے تو جیون لال نے ۱۰ اگست کے روزنامچے میں جو یہ لکھا ہے کہ "حکیم احسن اللہ شریکِ دربار ہوئے اور ایک اشرفی پیش کی" (ص ۲۱۳)، تو کیا اس کا یہ مطلب ہوا کہ حکیم صاحب بھی پہلی بار کہیں سے دہلی ۱۰ اگست ۱۸۵۷ء کو

آئے تھے اور پہلی بار شریک دربار ہوئے تھے؟

حکیم احسن اللہ خاں نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے کہ مولینا نے بہادر شاہ سے کہا کہ مجاہدین کی مالی اعانت کیجیے۔ بادشاہ نے خزانہ خالی اور مال گزاری وصول نہ ہونے کا عذر کیا تو مولوی صاحب نے جواب دیا کہ

"آپ کے تمام ملازمین نا اہل ہیں ... کسی ہوشیار آدمی کو رسد کی فراہمی پر مامور کیجیے۔ میرے لڑکے (مولینا عبدالحق) اور دوسرے اعزّہ تحصیل داری کا کام انجام دیں گے اور رسد بھی فراہم کریں گے"۔

مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

"جس تاریخ کو سپاہ آئی (۱۱ مئی) دوسرے روز (۱۲ مئی) قلعے میں اکابر شہر کی ایک مجلس مقرر ہوئی کہ شہر کا اور سپاہ کی رسد رسانی کا انتظام کیا جائے۔ اگر بندوبست نہیں ہوگا تو وہ (سپاہی) سارے شہر کو لوٹ کر کھا جائیں گے۔ اِس کا اہتمام محبوب علی صاحب اور میر نواب پسر تفضل حسین خاں وکیل کے سپرد ہوا" ص ۶۷۹

حکیم احسن اللہ نے مولینا اور بہادر شاہ کی گفتگو کی تاریخ نہیں لکھی۔ مولوی ذکاء اللہ نے تاریخ متعیّن کر دی ہے۔ مولینا کے مشورے کی بنا پر اُن کے ایک عزیز میر نواب کو رسد رسانی کی ذمے دار سب کمیٹی کا رکن بنا دیا گیا۔ میر نواب مولینا کے داماد سیّد احمد حسین رسوا خیرآبادی کے حقیقی

بھائی تھے! محمد حسین اور میر نواب دونوں سید تفضل حسین خاں کے بیٹے تھے جو غالب کے دوست تھے۔" سبد باغ دو در" میں سید صاحب کے نام غالب کے، خطوط ہیں۔ مومن خاں سے سید تفضل حسین خاں کے تعلقات اور بھی گہرے تھے۔ انھوں نے مومن کے بیٹے احمد نصیر کو متبنیٰ کر لیا تھا۔ "انشائے مومن" میں کئی خطوط سید صاحب کے نام ہیں۔ مومن نے سید صاحب کے مکان کی تعمیر، باغ کی تعمیر وغیرہ پر بھی قطعاتِ تاریخ کہے تھے، اور میر نواب کی شادی پر بھی (۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء) میں قطعۂ تاریخ لکھا تھا۔[1]

بہر حال میر نواب مولانا فضلِ حق کے قریبی عزیز اور معتمد تھے اور اُن کا ڈورکنی سب کمیٹی میں ۱۲ رمئی ۱۸۵۷ء کو انتخاب مولانا فضل حق کی بہادر شاہ سے ۱۱ رمئی کی گفتگو کے نتیجے میں ہوا تھا۔[2]

مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:[2]

" انھوں (مولانا فضل حق) نے بادشاہ (بہادر شاہ) کے لئے ایک دستور العمل سلطنت لکھا تھا جس کی ایک دفعہ یہ مشہور ہوئی تھی کہ گائے کہیں بادشاہی عملداری میں ذبح نہ ہو۔"

مولوی ذکاء اللہ ہی کا بیان ہے کہ:[3]

" ۹ رجولائی ۱۸۵۷ء کو اوّل حکم بادشاہ کا جو صادر ہوا

---

[1] کلیاتِ مومن ص ۱۸۹، [2] تاریخ عروجِ سلطنت انگلشیہ ص ۶۸۷،
[3] ایضاً ص ۶۶۱ نیز جیون لال غدر کے صبح و شام ص ۱۶۳

وہ یہ تھا کہ گائے کہیں ذبح نہیں کی جائے گی۔ ۹ رجولائی کو
ڈھنڈورا پٹوایا کہ جو گائے ذبح کروائے گا وہ توپ کے
منھ سے اڑایا جائے گا۔"

ظاہر ہے کہ ۹ رجولائی کو جس دستور کی پہلی دفعہ باقاعدہ نشر اور نافذ کر دی گئی تھی وہ دستور اُسی دن تو بہادر شاہ کو پیش نہیں ہوا ہوگا بہادر شاہ کے مطالعے، نقد و نظر، رد و کد، تذبذب و تامل اور اس کے مشیروں کے مشوروں کی ہفت خواں طے ہونے کے بعد اس کی بعض دفعات کے نشر و نفاذ کا فیصلہ ہوا ہوگا اور یہ بات تو بہادر شاہ سے متعلق تھی۔ جس شخص نے اُسے مرتب کیا تھا تو یہ سلطنت کا دستور تھا خطوطِ غالب نہیں تھے کہ بیٹھے اور لکھ مارا۔ مطالعہ فکر و مشورت کی جانے کن کن جاں کاہیوں کے بعد یہ تسوید و تبییض کی منزل سے گزرا ہوگا۔

بہرحال مولوی ذکاء اللہ کے دونوں مندرجہ بالا اقتباسات سے مولانا فضل حق کا جولائی سے بہت پہلے دہلی میں ہونا ثابت ہوتا ہے اور حکیم احسن اللہ خاں اور مولوی ذکاء اللہ کے سابقہ اقتباسات سے مولانا کا ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں ہونا متعین ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر مہدی حسن نے بھی ذکاء اللہ کے اس اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مولانا آغاز غدر کے فوراً بعد (شارٹ ہسٹری آف دی آؤٹ بریک آف میوٹنی) دہلی آ گئے تھے۔ ص ۳۸۹

مولانا نے ۲۶ جولائی کو فارسی میں ایک خط بنام مرزا مغل لکھا ہے جس میں مطالبہ کیا ہے کہ ان کی جنرل بخت خاں سے ملاقات میں جو گفتگو ہوئی ہے اس کی تفصیل سے مجھے (فضل حق) آگاہ کریں۔
میوٹنی پیپرس بکس ۱۰۰ نمبر ۹۶، ۲۶ جولائی) ڈاکٹر مہدی حسن ص ۳۹۱

اِن حقائق کے بعد اب آپ جناب مالک رام کا یہ فیصلہ ملاحظہ فرمائیں:

"غرض پورے حالات کو بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا فضل حق مرحوم نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں واقعی کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ انھوں نے اس سے پہلے لوگوں کو جو بھی تلقین کی ہو (اور اس کی طرف انھوں نے ایک جگہ اشارہ بھی کیا ہے) لیکن جب ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً اس سے الگ تھلگ رہے نہ علمی پہلو سے اس میں شریک ہوئے نہ عملی لحاظ سے۔ انھوں نے نہ کوئی فتویٰ لکھا نہ تلوار اٹھائی۔"

سب سے پہلے تو آپ یہ سُن لیں کہ مالک رام صاحب نے یہ قطعی فیصلہ اپنے اس مضمون (تحریکِ دہلی جون ۱۹۶۰ء) میں صادر کیا ہے جس میں انھوں نے مولانا فضلِ حق کے مقدمہ کی مِسَل نیشنل آرکائیوز آف انڈیا سے حاصل کر کے اس کے مشمولات کا اردو ترجمہ شائع کر دیا ہے۔ اس مِسل میں وہ فیصلہ بھی جو اسپیشل کمشنر نے مولانا کے

کے مقدمے کا دیا تھا۔ اس میں مولینا کی دہلی کی باغیانہ سرگرمیوں کا اس طرح ذکر کیا ہے:

"اس کی گرفتاری کے بعد دہلی سے اس کے پُرانے تعلقات کے باعث وہاں حکام سے بھی اس کے متعلق استصواب کیا گیا تو کمشنر دہلی نے اس کے جو جوابات تحریر کیے ان سے معلوم ہوا کہ ۱۸۵۷ء میں دہلی میں بھی اس کی سرگرمیاں بعینہ اسی قسم کی (باغیانہ) تھیں... وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے وہ دیدہ ودانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بقدم چلتا رہا۔"

سقوطِ دہلی کے بعد اودھ میں مولینا تحریکِ جہاد میں جو حصّہ لیا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کمشنر لکھتا ہے:

"وہ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کے دوران میں بغاوت کا "سرغنہ" رہا اور دہلی اور اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور قتل کی ترغیب دی .... اس نے بوندی کے مقام پر ۱۸۵۸ء میں باغی سرغنے ممو خاں کی مجلسِ مشاورت میں "نمایاں حصّہ" لیا۔ اس نے بوندی کے مقام پر مئی ۱۸۵۸ء میں ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کو قتل کرنیکی ترغیب دی....."

اُس نے قرآن کی آیات پڑھیں اور اُن کے من مانے معنی کیے اور اصرار کیا کہ انگریزوں کے ملازم کافر اور مرتد ہیں اور اس لیے شریعت کے نزدیک ان کی سزا قتل ہے .... وہ باغیوں کی مجلس شوریٰ (بریلوی کونسل) کا اہم "رکن" تھا .... یہ بات ان ایام میں عام طور پر مشہور تھی کہ چند آدمی بیگم (حضرت محل) کے مشیرانِ خاص ہیں۔ باغی فوج میں ان کی "ارباب شوریٰ" کے نام سے شہرت تھی، بلکہ کبھی کبھی انھیں "کھری پارلیمنٹ" کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ اس شوریٰ میں ملزم (مولینا) بہت ممتاز تھا .... یہ تو ظاہر ہے کہ ملزم بہت قابل آدمی ہے، لیکن جس طرح اوپر بیان ہوا اس نے بے ایمانہ ہوس یا مذہبی تعصّب کے باعث باغیوں سے اپنا رشتہ جوڑا اور ان کا مشیر بن گیا۔ وہ خطرناک ترین آدمی ہے جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس لیے انصاف اور امن عامّہ کا تقاضا ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے .... ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنا چاہیئے اور اسے خاص طور ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیئے"

مالک رام صاحب جنھوں نے اپنے مضمون میں یہ فیصلہ عدالت

نقل کیا اور اس پر تنقید بھی نہیں کی، حیرت ہے کہ تحریکِ جہاد میں مولٰنا کی شرکت سے کلیتہً انکار کس طرح کر رہے ہیں؟

عدالت کے اس فیصلے کے علاوہ ہم مولٰنا کی شرکت کے ثبوت میں پانچ معاصرین کی شہادت پیش کرتے ہیں:

(۱) جیون لال کا گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے جو ۱۶ اگست ۲/۶/۷ ستمبر کو لال قلعے میں مولٰنا کو موجود پاتا ہے۔ ایک دن مولٰنا نے بادشاہ سے صورتِ حالات کے متعلق گفتگو کی۔ ایک دن مولٰنا نے بادشاہ کو یو پی میں مجاہدین کی سرگرمیوں کے متعلق اطلاع فراہم کی۔ ایک دن بادشاہ کے دربار میں تمام امراء و رؤسا کے ساتھ مولٰنا بھی شریک ہوئے۔

(۲) ایک دوسرا معاصر عبداللطیف ۱۹ اگست ۱۸۵۷ء کے روزنامچے میں لکھتا ہے[۱]:

"جب ہنگامہ برپا ہوا تو مولوی فضل حق آئے دربار میں حاضر ہوئے، نذر پیش کی، رُوپیہ صدقے اتارا۔ انھیں اِنتظام سنبھالنے کی خواہش تھی۔"

(۳) دورانِ غدر میں دہلی کے کوتوال سید مبارک شاہ کا بیان[۲] ہے کہ بخت خاں

---

[۱] سن ۱۸۵۷ تاریخی روزنامچہ مرتبہ خلیق احمد نظامی دہلی ص ۹۶ ۔ [۲] انڈیا آفس منوسکرپٹس آف آر ایم ایڈورڈس ٹرانسلیشن آف سید مبارک شاہز نریٹیو آف سینز آف دی دہلی۔ بحوالہ دی گریٹ ریولیوشن آف ۱۸۵۷ء از ڈاکٹر سید معین الحق ص ۱۸۲ کراچی ۱۹۶۸ء قاضی فیض اللہ کوتوال شہر کے مستعفی ہونے پر سید مبارک شاہ رامپوری کو کوتوال شہر مقرر کیا گیا اور آخر آخر غدر تک وہی رہا) عروج سلطنت انگلشیہ ص ۱۸۸

مولوی سرفراز علی اور مولانا فضلِ حق پر مشتمل ایک کنگ کونسل تشکیل دی گئی۔

(۴) انگریزوں کا ایک مخبر تراب علی یکم ستمبر ۱۸۵۷ء کے خفیہ خبر نامے میں برطانوی حکام کو مطلع کرتا ہے[۱] کہ باغیوں نے ایک انتظامی مجلس تشکیل دی ہے جس کا نام انھوں نے کوٹ (KOTE) (کذا) رکھا ہے اس کے ارکان میں جنرل غوث محمد خاں بریگیڈیر ہیرا سنگھ جنرل بخت خاں محمد شفیع رسالدار، حیات محمد رسالدار، قادر بخش صوبیدار سفر مینا، نتھو صوبیدار، ہردت صوبیدار وغیرہ کے علاوہ ہر رجمنٹ کے ۵، ۵ سپاہی بھی شامل ہیں اور

"MOLVI FAZLHAQ IS ALSO A MEMBER"

(مولوی فضل حق بھی اس کورٹ کے ایک رکن ہیں)

(۵) ایک اور نام ور معاصر حکیم احسن اللہ خاں اپنی یادداشتوں[۲] میں لکھتے ہیں:

"دوسرے روز مولوی فضل حق آئے اور نذر پیش کی۔ وہ باغی فوج کی بڑے زور شور سے تعریف کر رہے تھے۔

---

[۱] موٹنی ریکارڈ کرسپنڈنس، لاہور ۱۹۱۱ء ص ۹ (مراسلہ ۲۷۹) از جی سی بارنس کمشنر کلکٹر سیس ستلج بنام سیکریٹری چیف کمشنر پنجاب مورخہ ۳ ستمبر ۱۸۵۷ء

[۲] مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق ۱۹۵۸ء ص ۲۳

انھوں نے بادشاہ سے کہا اب وقت کا تقاضہ ہے کہ باغیوں کو رقم اور سامانِ رسد کی مدد پہنچائی جائے، تاکہ انھیں کچھ سہارا ہو۔ بادشاہ نے کہا رقم کہاں ہے؟ رہا رسد کا تو وہ پہنچی تھی، مگر ناکافی تھی اور اس کی وجہ ان باغیوں کا عوام کے ساتھ غلط رویّہ ہے۔ مولوی صاحب نے کہا، حضور کے تمام ملازمین نااہل ہیں۔ دُور اور قریب کے تمام حکمرانوں سے رقم کا مطالبہ کرنے کی اجازت دیجیے اور کسی ہوشیار آدمی کو رسد کی فراہمی پر مامور کر نے دیجیے۔ میرے لڑکے (مولینا عبدالحق) اور دیگر اعزہ تحصیل کا کام انجام دیں گے اور رسد بھی فراہم کریں گے۔ بادشاہ نے جواب دیا، آپ تو یہیں ہیں، آپ انتظام سنبھالیے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا، میرے بھتیجے اور دو بیروں کو گوڑگانوہ کی تحصیلداری اور کلکٹری کا پروانہ تقرر جاری کیا جائے وہ سب انتظام کریں گے اور الور، جھجر، بلّب گڑھ اور پٹیالہ کے راجاؤں کے نام بھی (رقم کے مطالبے کے) پروانے جاری کیجیے۔ پٹیالہ کا راجہ اگرچہ انگریزوں سے ملا ہوا ہے لیکن اگر دوستانہ مراسلت کی جائے تو وہ ساتھ آجائیگا۔ بادشاہ نے بتایا کہ پیرزادہ ابوالسّلام کی درخواست پر

پر بخت خاں نے راجہ پٹیالہ کو ایک پروانہ بھیج دیا ہے، مگر ابھی تک اس کا جواب نہیں آیا۔ مولوی صاحب نے کہا میں اپنے بھائی (فضل عظیم) کو جو راجہ کے یہاں ملازم ہیں، لکھوں گا کہ وہ جلد جواب بھجوائیں۔

مولوی صاحب جب بھی بادشاہ کے پاس آتے بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جہاد کی مہم میں اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں اور ان کے ساتھ باہر (میدان میں) بھی نکلیں، فوجی دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں ورنہ اگر انگریز جیت گئے صرف خاندان تیموریہ بلکہ تمام مسلمان نیست و نابود ہو جائیں گے۔

تقریباً یہی بات حکیم احسن اللہ نے بہادر شاہ کے مقدمے کے دوران عدالت میں شہادت دیتے ہوئے کہی تھی:[۱]

"زمین داران گوڑ گانوہ نے بادشاہ کو ایک درخواست ارسال کی تھی جس میں بدنظمی کا ذکر کر کے التجا کی تھی کہ کوئی افسر نظم و نسق کے لئے مقرر کیا جائے۔ مولوی فضل حق نے جو الور سے آئے تھے، اپنے بھانجے کا (جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا) کی سفارش کی کہ وہ وہاں مقرر کر دیا جائے، کیوں کہ گورنمنٹ برطانیہ کے دور حکومت

---

[۱] بہادر شاہ کا مقدمہ ص ۲۵۶/۲۵۷ [۲] مولوی فیض الحق لکھا ہے۔

میں بھی وہ اس ضلع میں مقرر تھا۔ چنانچہ یہ شخص ضلع دار مقرر کیا گیا، مگر میں آگاہ نہیں ہوں کہ وہ گوڑگانوہ گیا یا نہیں، البتہ اتنا معلوم ہے کہ زوال دہلی کے ۱۵/۲۰ روز قبل یہ تقرر ہوا تھا۔ مولوی فضل حق نے بھی کئی تحصیل داروں کو ضلع دار کی نیابت میں مقرر کیا گیا تھا۔"

انگریزوں کے جاسوس جیون لال نے اپنے روزنامچے میں اس تاریخ کا تعین کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے[1]:

"۱۹ اگست ۱۸۵۷ء.... عبدالحق خلف مولوی فضل حق اور مولوی فیض احمد لگان وصول کرنے کی غرض سے گوڑگانوہ گئے۔"

یہ پانچوں معاصر شہادتیں ان کی دہلی کی باغیانہ سرگرمیوں میں شرکت سے متعلق تھیں۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں سقوط دہلی کے بعد مولینا نے دہلی کو بادیدۂ نم الوداع کہا اور اس کے بعد وہ جنوری ۱۸۵۹ء تک مسلسل دوسرے مجاہدین کے ساتھ اودھ میں سرگرم جہاد رہے، اس لئے اودھ کے معاصر حکام کی شہادت ملاحظہ ہو:

"اودھ کے چیف کمشنر کا سیکرٹری ہمیرپور کے کلکٹر کے

---

[1] غدر کی صبح و شام دہلی ۱۹۲۶ء ص ۲۲۲

نام ۸ دسمبر ۱۸۵۸ء کو اپنے سرکاری مراسلے میں لکھتا ہے:
"باغی بسوا میں، جو لکھنؤ سے شمال مغرب میں پچاس میل کے فاصلے پر ہے، شکست کھا کر ۵ دسمبر کو گنگا فرار ہو گئے ..... ان کی تعداد ۹۰۰ سوار، جن میں ۴۰۰ پوری طرح مسلح ہیں اور باقی سپاہیوں کے پاس اسلحہ کافی نہیں ہے، ۳۰۰ پیدل وغیرہ تھے۔ ان میں سے ۱۰۰ عورتیں، ۶ ہاتھی، ایک توپ جس کا نام گروہ ہے۔ اس جماعت کے لیڈر فیروز شاہ شہزادہ دہلی، لکڑ شاہ، گلاب شاہ عرف پیر جی، محسن علی خاں ساکن منٹو شمس آباد فرخ آباد (جو خود کو یوریپین ظاہر کرتا ہے) اور مولوی فضل حق سابق سررشتہ دار کمشنر دہلی جس کے بہت سے اعزہ اعلیٰ مناصب حکومت پر ہیں اور جس کا بھائی پٹیالہ میں راجہ ہری سنگھ کا ملازم ہے۔"[1]

یہی سیکرٹری ۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سیکرٹری کے نام اپنے ایک سرکاری مراسلے میں[2] لکھتا ہے:

"مندرجۂ ذیل لوگوں کے چلے جانے کے بعد حکومت کو قیام امن میں کافی سہولت ہو رہی ہے۔ فیروز شاہ

---

[1] فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش حصہ دوم ص ۱۳۰ و حصہ پنجم ص ۱۸۱ لکھنؤ ۱۹۵۸ء (انگریزی) [2] فریڈم اسٹرگل ص ۵۱۵

نادر شاہ، مولوی فضل حق، جو ہماری حکومت کا دشمن ہے، حالانکہ حکومت نے اسے اور اس کے اعزّہ کو اعلیٰ مناصب عطا کئے تھے"

جاں

لکھنؤ چیف کورٹ میں غدر سے متعلق بستہ (فائل) میں ٹھیک اسی دور کے ایک حاکم کا مراسلہ[1] ہے، جس میں محمدی (ضلع لکھیم پور کھیری) کے قرب وجوار میں مولینا فضلِ حق اور ان کے رفقائے جہاد کی سرگرمیوں کے تجسس کی جو کوشش برطانوی حکام کر رہے تھے اس کا ذکر ہے اور لکھا ہے کہ:

"کچھ لوگ مولوی فضل حق کی صحیح خبر لانے کے لئے بھیجے گئے ہیں جو اپنے متبعین کے ساتھ شاہ آباد کی طرف روانہ ہوئے ہیں"

معاصرین کے بعد اب قریب تر عہد کے مورخین کے حوالے بھی ملاحظہ ہوں۔ مولینا کی وفات کے صرف ۹ سال بعد مشہور انگریز مصنف ہنٹر اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے اس وقت کے صدر مدرس علامہ عبدالحق خیرآبادی فرزند علامہ فضل حق خیرآبادی کے متعلق لکھتا ہے[2]

"موجودہ ہیڈ مولوی اس عالمِ دین کے صاحبزادہ ہیں"

---

[1] فریڈم اسٹرگل ص ۵۱۸۔ [2] "ہمارے ہندوستانی مسلمان" ص ۲۴۱ مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین طبع دوم ۱۹۵۵ء لاہور

جن کو ۱۸۵۸ء کے غدر نے "نمایاں کر دیا تھا اور جنھوں نے
اپنے جرموں کا خمیازہ اس طرح بھگتا تھا کہ بحرِ ہند کے
ایک جزیرے میں تمام عمر کے لئے جلا وطن کر دیئے جائیں
اس غدار عالمِ دین کا کتب خانہ جس کو حکومت نے
ضبط کر لیا تھا اب کلکتہ کالج میں موجود ہے"

مولوی ذکاء اللہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو سن ستاون میں ۲۵ سال کے تھے اور دہلی کی جنگِ آزادی کے عینی شاہدوں میں سے تھے اور انھوں نے اس کے ۲۰/۲۵ سال بعد ہی اپنی تاریخ مرتب کی۔ ان کا بیان ہے کہ[1]

"ان (مولانا) کو اس "بغاوت" کے سبب سے جلا وطنی
کی سزا ملی تھی"

خود مولانا فضل حق نے اپنے عربی رسالے "غدریہ" میں جو واقعاتِ غدر پر ایک مستند و معتمد دستاویز بھی ہے۔ اگرچہ اپنی سرگرمیوں کے متعلق از راہِ انکسار اور مدحِ خود سے احتراز کے پیشِ نظر یا ممکن ہی اُس وقت کے مہیب، دپُر خطر ماحول کے باعث بہت کم لکھا ہے، مگر پھر بھی اتنا ضرور لکھ گئے ہیں کہ دہلی پہنچ کر

اشرت الی الناس بہ ا (تحریکِ آزادی کے سلسلے میں) میری جو
اقتضی رائی وفضی بہ رائے تھی اور میری عقل کا جو فیصلہ تھا

---

[1] تاریخِ عروج سلطنت انگلشیہ ص ۶۸۷

عقلی فلم یاتمروابما اشرات ولم باتمروا بما امرت	میں نے لوگوں کے سامنے رکھا مگر انھوں نے میری رائے اور میری ہدایت کو نہ مانا۔

اِسی طرح غدر ہی سے متعلق اپنے قصیدۂ ہمزیہ میں انڈمان سے لکھتے ہیں :

قد قمتُ ارجی القاعدین الی الوغی	میں (تھک کر) بیٹھ جانے والوں کو مسلسل ہمت دلاتا رہا۔

ضمیمہ ۱

عرضی رقم زدہ مولوی فضل حق صاحب

از طرف

رعایائے شہر در باب امتناع ٹیکس وغیرہ

حضرت جہاں پناہ! خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ، بعرض اقدس و اعلیٰ (می رساند) برائے جہاں آرائے اقدس روشن و مبرہن است کہ رعایائے ایں ملک چہ ہنود وچہ مسلماں برخے ازاں ہا مزارعاں وکشاورزاں و اکثر روزگار پیشہ وبعض ازاں ہا تجار واکثرے اہل حرفہ و بعض لاخراج دار و روزینہ دار وبعض دریوزہ گر بودہ اند واکثرے از اہل اسلام وبعض ہنود اصل متوطن ایں جا نیستند بلکہ بہمراہی حکام وسلاطین ترک اوطان خود ہا (کردہ) دریں (جا) توطن گزیدہ اند تا وقتے کہ ممالکت ہندوستان بقبضہ وتصرف سلاطین وراجگاں بود وجہ معیشت سکان ایں دیار ہیچ گونہ تنگی نکردہ بود کہ ہمگی وجوہ معاش کہ خدمات عمدہ وجہ روزگار سپاہ صرف بسکنۂ ایں دیار اختصاص داشت ہر کس از سکنہ ہمیں ملک بقدر حوصلہ وفراخور لیاقت خود روزگارے در اہل مناصب یا در زمرۂ سپاہ یا در پیشہ تجارت یا در حرفہ میداشت از زمانے کہ عملداری سرکار انگریزی در مملکت ہندوستان

رسیدہ است بتدریج تنگی روزی وضیق معاش رفتہ رفتہ الحال بحدے رسیدہ است کہ نوبت بجان وکارد باستخواں رسیدہ زیرا در سرکار انگریزی ہمگی وجوہ معاش مفقود وابواب روزی مسدود شدہ اند بجز معدودے چندیعنی چند کس در عملۂ عدالت دیوانی وکلکٹری و فوجداری و پرمٹ وتھانہ وتحصیل بمشاہرۂ قلیل ملازم اند وپس از تبدیل دفاتر وتغیر طرز نوشت وخواند کچہری ہا چناں تخیل می گردد کہ در چندے ایں روزگار ہم نصیب ایں بے چارگان نہ خواہد ماند۔ ایں است حال تنگی معاش روزگار سکان ایں دیار وحال تجاراں است کہ سرکار انگریزی ہمہ وجوہ تجارت خود اختیار نمودہ وہمگی اجناس از قسم پارچہ و ریسمان وظروف واسپاں وغیرہ دواب خود از ملک انگلستان وغیرہ بہم رسانندہ، دریں ملک برائے فروش علی التواتر در ہر قریہ وبلدہ از بلاد ایں ملک می آرد ومنفعتے برائے کسے از سکنۂ ایں دیار نمی گذارد۔ دریں جہت ہمہ تجاراں ایں دیار از پیشۂ خود دست بردار شدند وحال لاخراجیداراں اینست کہ ہمہ لاخراجی باوجود ایں کہ در قوانین سنہ ۱۸۰۳ء وسنہ ۱۸۰۵ء سرکار انگریزی عہد ومیثاق نوشتہ اند کہ ہر اراضی لاخراجی کہ پیش از غرۂ جنوری سنہ ۱۸۰۱ء وغرۂ جنوری ۱۸۰۳ء بقبض وتصرف لاخراجیدار خواہد بود، گو سند باشد یا نہ یا واہب آں اختیار عطا داشتہ باشد یا نہ گاہے منضبطی نہ خواہد آمد الحال بلا ہیچ تحقیقات وبلا تامل در ہر یک ضلع ضبط شدہ می شود حالا از وجہ معیشت لاخراجیداراں بالمرہ مسدود شدہ

است در روزے کہ یک قلم در ہمہ اضلاع موقوف شدہ است ایں وجہ معیشت ہم باقی نماندہ، وحال مزارعاں وکشاورزاں اینست کہ براں ہا آں چناں جمع خراج مقرر شدہ است کہ دراں حالتے واستطاعتے باقی نماندہ است، وحال بے استطاعتی وبے مقدوری آنہا خود از دفاتر کلکٹری ظاہر وہر گا ہے کہ برائے ایں سکان ایں دیار وجہ معیشت باقی نہ ماند اہل حرفہ چہ کار برائے کدام کس تواند کہ بذریعہ آں برائے خود کسب معیشت تواند نمود وہر گا ہے کہ ہمگی خلائق از معیشت خود تنگ باشد بدریوزہ گر کدام کس تواند داد؟ ایں ہمہ حالات اجمالی تنگی معاش جملہ رعایائے ہندوستان ست۔

وحال تنگی معاش رعایائے علاقہ شاہ جہاں آباد مجملاً اینست کہ در ابتدائے عمل سرکار انگریزی پرگنہ ہوڈل وپلول وپتین ونجف گڈھ وسالکہ وفیروز آباد وڈیگ وپوناہانہ وسانگرس وبجنور وسونی پت وگوہانہ وجرسٹہ وکھرکھودہ وروہتک ومہم وہانسی وحصار وغیرہ پرگنات در جاگیر بودند ودر سرکارات جاگیرداران ایں ہمہ پرگنات ہزار ہا کساں در سرکار ودر فوج وشاگرد پیشہ ملازم بودند واکثر دیہات در وبست واراضیات لاخراجی متصرفہ در معافی بودند، ایں ہمہ پرگنہ ودیہات واراضیات بحیطۂ ضبطی در آمدند ومعیشت لکوک کساں بالمرہ موقوف شدہ حالا در تمام عالم روزگار ہمچو عنقا ناپدید است وبوہا دبے چارگاں از مسدودی روزینہ وضبطی املاک مدار

بر سر بر داوقات خود با بر چرخہ زنی در ریسماں فروشی و آسیا سازی می داشتند بسبب ایں کہ سرکار تجارت ریسماں اختیار کردہ و آسیا ہائے آبی نصب نمودہ است ایں وجہ معیشت آنہا بالمرہ مسدود گردید، و ہم چنیں ایں حرفہ ددکان داراں و ساہوکاراں (بہ سبب بضاعتی خلائق از انتفاع مایوس گشتہ سرمایہ کہ داشتند بصرف خورد و نوش در آوردہ اند باایں ہمہ تنگی ہا از عدل سر چارلس مٹکاف صاحب بہادر مصادرۂ ادائے زر چوکیداری بہ ما بے چارگاں چار و نا چار کہ حکم حاکم مرگ مفاجات است، دادن مصادرہ باوصف آں کہ گاہے از عہد سلاطین و حکام سلف علت آں نداشتیم بذمۂ خود نہادہ تا حال کردہ ایم حالا چند روز است کہ صاحب مجسٹریٹ حال در ہر کوچہ و برزن و بازار بہ تعمیر پھاٹک، ہائے قدیم و جدید کہ ہیچ یک فائدہ براں مترتب نیست و گاہے مترتب نخواہد شد حکم داد ند ما غربا جبراً و کرہاً تکالیف فاقہ کشی و بیع و رہن اسباب خورد و نوش برداشتہ بصرف ہزارہا روپیہ تعمیل حکم نمودیم و تکالیف ہر روزہ (کہ) از مسدود ماندن دروازہائے نو تعمیر و غائبی چوکیداران ہر یک محلہ، در بست و کشاد آں عائد حال ما یان می شود بہ خود گوارا می نمائیم- الحال علاوہ ازیں خبر صاحب مجسٹریٹ حال حکم تقرر ہیچ ہیچ کس پنجاں در کوچہ و محلہ ...."

(نوائے ادب جولائی

سنہ ۱۹۶۲ء)

ضمیمہ ۲

قواعد و ضوابط کورٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از آنجا کہ واسطے رفع برہمی سررشتہ اور موقوفی بدانتظامی طریقہ فوجی اور ملکی کے مقرر ہونا دستور العمل کا واجب اور مناسب اور واسطے عمل در آمد دستور العمل کے اوّلاً معین ہونا کورٹ کا ضروری ہے۔ اس لئے حسبِ ذیل قواعد لکھے جاتے ہیں:

۱۔ ایک کورٹ قائم کی جائے اور اس کا نام کورٹ ایڈمنسٹریشن بمعنی جلسۂ انتظام فوجی و ملکی رکھا جائے۔

۲۔ اِس جلسے میں دس آدمی مقرر کیے جائیں، اس تفصیل سے کہ چھ جنگی اور چار ملکی ہوں اور جنگیوں میں دو شخص پلٹن پیادگان سے اور دو شخص رسالہ ہائے سواراں سے اور دو سررشتہ توپ خانہ سے منتخب کیے جائیں اور ملکی چار شخص۔

۳۔ ان دس شخصوں سے ایک شخص بالتفاق غلبہ آرائے پریسیڈنٹ یعنی صدر جلسہ اور ایک شخص وِیس پریسیڈنٹ یعنی نائب

صدر جلسہ مقرر ہو اور رائی صدر جلسہ کی برابر دو رائے کے قرار پاوے گی اور ہر ایک سر رشتہ میں بقدر ضرورت سکتر مقرر کئے جائیں اور پانچ گھنٹے ہر روز (؟) جلسہ کورٹ کا....

۴۔ ان شخصوں کے مقرر ہونے کے وقت حلف ان باتوں کا لیا جائے کہ کام کو بڑی دیانت اور امانت سے بلا رُو رعایت کمال جانفشانی سے اور غور و فکر سے سرانجام کریں گے اور کوئی دقیقہ دقائق متعلقۂ انتظام سے فروگذاشت نہ کریں گے اور حیلتاً اور صراحتاً اخذ اجر یا رعایت کسی طرح کی کسی لحاظ سے وقت تجویز امور انتظام کورٹ میں نہ کریں گے، بلکہ ہمیشہ ساعی اور سرگرم ایسے انتظام امورات سلطنت میں مصروف رہیں گے کہ جس سے استحکام ریاست اور رفاہ اور آسائش رعیت ہو اور کسی امر مجوزہ کورٹ کو بے اجازت کورٹ اور صاحب عالم قبل اجرائے اوس کے صراحتاً یا کنایتاً کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔

۵ ۔ انتخاب اشخاص کورٹ کا اس طریقے سے کہ غلبۂ آرائے سے دو دو شخص پلٹن پیادگان اور رسالہ ہائے سواران سے اور سر رشتہ توپ خانہ جنگی سے جو قدیم الخدمت اور ہوشیار اور واقف کار اور لائق و عقیل ہو کئے جاویں اور اگر کوئی شخص ہوشیار، بہت ـــــ عقیل و فہیم اور لائق انصرام کار

کورٹ ہوا اور شرطِ قدیم الخدمتی اوس میں نہ پائی جائے تو یہ ایک امر خاص ان صورتوں میں مانع تقرر ایسے شخص کا نہ ہوگا اور اسی طرح تقررِ چہار شخص ملکی کا بھی عمل میں آوے گا، بعد مقرر ہونے دس شخصوں کے اگر کوئی شخص جلسۂ انتظام کورٹ میں رائے اپنی کسی امر میں ایسی خلافِ دیانت اور امانت اور محمول اوپر رعایت کسی کے ہووے گا تو . . . . کامل غلبہ آرائے کورٹ سے وہ شخص موقوف کیا جاوے گا اور دوسرا شخص حسبِ قاعدہ پانچویں[1] . . . اوس کے انتخاب ہوگا۔

جو امورات انتظام کے پیش آویں اوّل تجویز ان کی کورٹ میں ہوگی ——— اور بعد منظوری صاحب عالم بہادر کے اطلاع رائے کورٹ سے حضور والا میں ہوتی رہے گی۔

۷۔ بعد مرتب ہونے رائے غلبہ آرائے جلسۂ کورٹ سے واسطے منظوری کے پیش گاہ حضور صاحب عالم بہادر میں پیش ہونگے اور کورٹ ماتحت حکومت صاحب عالم بہادر ممدوح کے رہے گی اور کوئی امر امور انتظامی، جنگی و ملکی کے تجویز کورٹ اور بلا منظوری صاحب عالم محتشم الیہ اور بلا اطلاع حضور والا قابلِ اجرائی نہ ہوگا اور در صورت اختلاف رائے صاحبِ عالم بہادر بعد تجویز ثانی کورٹ وہ رائے بحالت

---

[1] بمقام

اختلاف بوساطت صاحب منظم الیہ پیش گاہ حضور ظلِ سبحانی میں پیش ہو اور اس میں حکم حضور کا ناطق ہوگا۔

۸۔ کورٹ میں سوائے اشخاص مقررہ جلسہ کے بجز صاحب عالم بہادر اور حضرت ظلِ سبحانی کوئی شخص شریکِ جلسہ اور حاضر نہ ہوگا اور جب اشخاص معینہ کورٹ میں سے بعذر قوی لائقِ پذیرائی ایک شخص اپنے زمرہ مقررہ سے حاضر جلسۂ کورٹ نہ ہو سکے تو رائے غلبہ آرائے اشخاص مابقی حاضرین جلسۂ کورٹ کے بمنزلہ رائے غلبہ رائے کل جلسۂ کورٹ کے متصوّر ہوگی۔

۹۔ جب کوئی شخص کورٹ میں سے بنسبت کسی امر کے رائے اپنی پیش کرنی چاہے تو اوّلاً اتفاق ایک رائے دوسرے شخص کا پہلے کر کے اس وقت رائے اپنی متفق علیہ دو شخص کورٹ میں پیش کرے۔

۱۰۔ جس وقت کوئی امر کورٹ میں موافق قاعدنویں کے پیش ہو اوّل پیش کرنے والا تقریر اپنی کورٹ میں بیان کرے اور جب تک بیان اس کا تمام نہ ہو کوئی شخص اس میں دخل نہ کرے۔ اہلِ کورٹ میں سے اگر کسی کو کچھ اعتراض ہو تو وہ پہلے اپنا اعتراض ظاہر کرے تا تمام ہونے اوس کے بھی کوئی دخل نہ دے اگر معترض پر کوئی تیسرا شخص تقریر درباب اصلاح یا ترمیم

کسی طرح کی کمی بیشی کے ساتھ پیش لاوے اور ما بقی اہل کورٹ کو سکوت ہو تو ہر ایک اہل کورٹ اپنی اپنی رائے علیحدہ لکھے، بعد ملاحظہ موافق قاعدہ آٹھویں کے غلبۂ آراء پر عمل ہوگا اور بعد منظوری ہر ایک سر رشتہ کے سکریٹر کے پاس بھیجی جاوے۔

۱۱- ہر ایک سر رشتۂ فوج کے جو اشخاص حسبِ قاعدہ دوسرے کے منتخب کیے جاویں گے وہی اشخاص اس سر رشتہ کے منتظم اور منصرم مقرر کیے جاویں اور ان کے تحت میں چار آدمی کی کمیٹی حسبِ طریقہ قاعدہ چوتھے کے قرار پاوے اور بقدر ضرورت اُسے اس کمیٹی میں بھی سکرٹر مقرر ہوں اور جو رائے اس کمیٹی میں غلبہ آرا سے مرتب ہوئے وہ رائے بذریعہ ان شخصوں افسر کمیٹی کے کورٹ میں پیش کی جاوے اور کورٹ سے موافق قاعدہ ساتویں کے عمل میں آوے اور یہی طریقہ ہر ایک سر رشتہ فوجی اور ملکی میں مرعی کیا جاوے۔

۱۲- ہر وقت بمقتضائے مصلحت کورٹ کو اصلاح اور ترمیم قواعد دستور العمل ہٰذا کا غلبۂ آرا سے اختیار دیا جاوے۔"

منقول از عکس مطبوعہ مقابل ص ۱۸۲ "بہادر شاہ دوم" از ڈاکٹر مہدی حسین (نیز ڈاکٹر سین کی "۱۸۵۷" کے مقابل ص ۴۲ اور میوٹنی پیپر کے ص ۳۶ بکس نمبر ۱۴۱ ۵- ۵۳۹

مآخذ

ا۔ اردو فارسی:

بہادر شاہ کا مقدمہ بار اول ۱۹۲۰ء دہلی
غدر کی صبح و شام بار اول ۱۹۲۶ء دہلی
غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط بار اول ۱۹۱۹ء
غدر کا نتیجہ (نصرت نامۂ گورنمنٹ) بار اول ۱۹۳۰ء
ہندوستانی مسلمان، از مسٹر صادق حسین بار سوم ۱۹۵۵ء لاہور
غدر کا تاریخی روزنامچہ (عبد اللطیف) مرتبہ خلیق احمد نظامی
داستانِ غدر ظہیر دہلوی
تاریخ عروج عہدِ سلطنت انگلشیہ ذکاء اللہ بار اول ۱۹۰۴ء
جنگِ آزادی از خورشید مصطفیٰ رضوی اول ۱۹۵۹ء دہلی (مکتبۂ برہان)
بیاضِ علامہ فضل حق خیر آبادی مملوکۂ حکیم مولوی نصیر الدین ندوی
رسالۂ غدریہ، علامہ فضل حق
حسرۃ العلماء بوفات شمس العلماء مولینا سید برکات احمد
حیاتِ طیبہ، مرزا حیرت طبع ۱۹۵۸ء لاہور
سبد باغ دو در مرزا غالب
کلیاتِ مومن
ماہنامہ تحریکِ دہلی اگست ۱۹۵۷ء و جون ۱۹۶۰ء
کلیاتِ نثر غالب

سہ ماہی نوائے ادب بمبئی جلد ۱۳ شمارہ ۳، جولائی ۱۹۶۲ء
قیصر التواریخ جلد دوم از سید کمال الدین حیدر مطبوعہ نولکشور کانپور ۱۹۰۷ء

انگریزی

* FREEDOM STRUGGLE IN UTTER PERDESH ED. BY A. A. RIZVI. LUCKNOW. 1958-1959.
* BAHADUR SHAH II. MEHDI HUSSAIN. DELHI. 1958.
* HISTORY OF THE INDIAN MUTINY. SIR JOHN KAVE MALLESON. LONDON. 1897-99.
* THE SEPOY MUTINY AND REVOLT OF 1857. R. C. MAJUMDAR. CULCUTTA. 1957.
* MUTINY RECORDS CORRESPONDENCE. LAHORE. 1911.
* PRESS LIST OF MUTINY PAPERS 1857. CALCUTTA. 1921.
* PRESS LIST OF MUTINY PAPERS 1857-58. LAHORE. 1925. (Correspondence and Reports)
* TWILIGHT OF THE MUGHALS. P. SPAEAR. LONDON.
* THE GREAT REVOLUTION OF 1857. S. MOINUL HUQ. KARACHI. 1968.
* MEMOIRS OF HAKIM AHSANULLAH KHAN. KARACHI. 1958.
* THE DICTIONARY OF INDIAN BIOGRAPHIES. 1906.

"1857" by DR. SIN.

-O-O-O-O-O-O-

مولینا خیر آبادی کی زندگی کے سلسلے میں

چند اغلاط کی تصحیح

دوسرے اعاظم رجال کی طرح مولینا فضل حق خیر آبادی بھی ابتدا ہی سے مختلف و متعدد "اغلاط" کا ہدف رہے ہیں اور ان اغلاط کی ایک خاص گروہ بڑے اہتمام سے بار بار دہراتا رہا۔ ہم مولینا فضل حق کے پرستار نہیں ہیں، ان کو خطا اور نسیان سے مبرا نہیں سمجھتے۔ ہو سکتا ہے کسی بڑے سے بڑے پاک باز میں کوئی اخلاقی کمزوری پائی جاتی ہو مگر ایک مورخ کی حیثیت سے ہمارا فرض یہ ہے کہ اس کے محاسنِ اخلاق کے ساتھ معائب کا بھی ذکر ناگزیر سمجھتے ہیں تو سنداور حوالے کے ساتھ کریں ؟ بے بنیاد بات، الزام، گپ اور افواہ کی قلعی بالآخر کھل کر رہتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص تو اپنی مظلومیت کی بنا پر ہمدردیوں کا مستحق بن جاتا ہے اور مورخ کی تحریر پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہے

اور اس کا بھرم باقی نہیں رہتا۔

مولانا فضلِ حق کے متعلق غلط بیانیاں زیادہ تر ایک خاص گروہ کے حضرات نے کی ہیں جس نے بھی شاہ اسمٰعیل شہید کے سوانح کو موضوع بنایا اس نے شاہ صاحب کی مدح کے ساتھ مولانا کی قدح کو بھی لازمی قرار دیا۔ مولانا کا جرم صرف یہ تھا کہ جب شاہ اسمٰعیل نے ۱۸۱۸ء میں امام معیّن کی تقلید ترک کر کے "تمسک بالکتاب والسُنّة" کا (بزعم خود) پرچم بلند کیا اور "تقویت الایمان" کے نام سے اُردو میں ایک رسالہ لکھا جس کا نہ صرف انداز بیان حُسنِ ادب سے عاری تھا، بلکہ جمہور امّت کے عقائد کے برعکس شفاعت کا انکار بھی کیا تھا اور نظیر نبی (صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلّم) کے امتناع کا بھی انکار تھا تو دہلی کے دینی حلقوں میں ہلچل مچ گئی اور وقت کے علما، جن میں اکثریت ولی اللّٰہی علما کی تھی سخت برہم ہوئے، مگر چوں کہ شاہ اسمٰعیل شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے تھے، اس لئے کسی کو حرفِ اختلاف زبان پر لانے کی جرائت نہ ہوتی تھی۔ اس نازک لمحہ میں مولانا فضلِ حق نے جرات سے کام لے کر امتناع النظیر کے مسئلے پر شاہ اسمٰعیل کے جواب میں ایک رسالہ تالیف فرمایا اور پھر "تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ" کے نام سے ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائی جس پر علمائے عصر اور خانوادۂ ولی اللّٰہی سے وابستہ علما کے بھی دستخط تھے۔ مولانا کے اس اقدام نے دوسرے علما کی بھی

ہمت افزائی کی اور وہ میدان میں آگئے۔ ابتدا نجی گفتگوؤں تک بات محدود رہی، مگر شاہ عبدالعزیز کے وصال (۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء) کے فوراً دہلی کی جامع شاہ جہانی میں ایک تاریخی مجلس مناظرہ منعقد ہوئی جس میں ایک طرف شاہ اسمٰعیل کے اعوان و انصار تھے دوسری طرف باقی علمائے حق پرست۔ شاہ اسمٰعیل تو دوران مناظرہ برہم ہو کر چل دیئے، مولوی عبدالحی بڈھانوی نے بھی اٹھنا چاہا، مگر نہ اٹھ سکے اور آخر میں انھیں کئی باتوں کو تسلیم کرنا پڑا اور لکھ کر دینا پڑا۔

مولینا فضل حق کا یہ وہ جرم ہے جو آجتک معاف نہیں کیا گیا اور ان کی تخفیف شان، تفسیق و تضلیل کا کوئی موقع اب بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ اور صرف مولینا فضل حق ہی تک بات محدود نہیں رہی، مولینا کے تمام وابستگانِ داماں اور اصحاب سلسلہ اس انتقام کا شکار ہیں۔ مولینا کے فرزند علامہ عبدالحق ان کے تلامذہ خصوصاً مولینا سیّد برکات احمد پر اتہامات ایسے ایسے ثقہ اور متدین اور داعی الی اللہ بزرگوں نے لگائے ہیں کہ انسان متحیر ہو ہو جاتا ہے میں ان اتہامات کا جائزہ "حیات عبدالحی پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک مضمون میں لے چکا ہوں (العلم کراچی اپریل۔ جون ۱۹۷۲ء) اس وقت صرف اُن کرم فرمائیوں کا جائزہ لینا مقصود ہے جو مولینا فضل حق کی ذاتِ گرامی پر روا رکھی گئیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا نام نواب صدیق حسن خاں

کا ہے۔ پہلے آپ مولانا صدیق حسن خاں کا ایک جملہ سُن لیں۔ مولوی محسن ترہتی نے اپنی کتاب "الیانع الجنی" میں شاہ اسمٰعیل کی تقویت الایمان پر یہ تبصرہ کیا تھا کہ اس کے بعض حصّوں میں عسل و تمر کی سی حلاوت ہے اور بعض میں حنظل کی سی تلخی ——— اس پر نواب صاحب فرماتے ہیں کہ مولوی محسن کے اس تبصرے کا راز یہ ہے کہ وہ مولانا فضلِ حق کے شاگرد ہیں اور

فانہ اول من قام بصددہ	مولانا فضل حق وہ پہلے آدمی ہیں،
وتصدیٰ لردہ فی رسائلہ	جنھوں نے شاہ صاحب سے اختلاف کیا اور اپنے ان رسائل میں شاہ صاحب
التی لیست علیھا اثارۃ	کا رد کیا جس میں علم کتاب و سنت کا
من الکتاب والسنۃ [1]	کوئی اثر و نشان نہیں ہے۔
......	

نواب صاحب کے اِس جملے سے آپ کو ہماری اس بات کی تصدیق ہو گئی ہو گی کہ مولانا سے کد صرف اس لئے ہے کہ انھوں نے شاہ صاحب کے رَد میں پہل کی تھی۔ پھر آپ نے انداز فکر بھی دیکھ لیا کہ ایک انصاف پسند نے تقویت پر ایک درمیانی سی بات لکھ دی تھی کہ اس میں حلاوت بھی ہے اور تلخی بھی تو یہ بھی گوارا نہ ہوا اور اس کو مولانا فضلِ حق کے تلمذ کے اثرات پر محمول کیا۔

نواب صاحب نے مولانا کے متعلق فرمایا ہے [1]

---

[1] ابجد العلوم بحوالہ نزہتہ الخواطر الجزء السابع ص ۵۹

کان زیہ زی الامراء	ان کی سج دھج علما کی سی نہیں تھی
دون العلماء	امرا کی سی تھی۔

ہم نے نواب صاحب کے اِس جملے کو اس لئے اہمیت دی ہے کہ یہ حضرات اس بات کو بار بار دہراتے ہیں۔ مرزا حیرت نے بھی یہی لکھا ہے اور مولوی سید عبدالحیؒ نے بھی اس کی تکرار کی ہے۔ لطف یہ ہے کہ بات کسی نے بھی واضح نہیں کی کہ زیٔ[1] علما اور زی امرا کا کیا مطلب ہے؟ اور ان دونوں میں بنیادی فرق کیا ہے؟ اگر ان حضرات کا یہ مطلب ہے کہ وہ غیر شرعی لباس پہنتے تھے تو صاف صاف لکھنا چاہیئے تھا کہ ہم شرعی لباس کا مطلب پوچھتے کیونکہ شریعت نے تو کچھ اصول اور کچھ حدود مقرر کر دیئے ہیں اور اس کے بعد آزادی دی ہے۔ ہاں قدامت پسند علمائے ہند بے شک اِس باب میں متشدد رہے، مگر اُن کے بھی معیار بدلتے رہے۔ پوشش سر کے سلسلے میں صافے کو شرعی لباس سمجھا جاتا اور علما کے لئے لازمی تصور کیا جاتا تھا، مگر مولٰینا ابوالکلام نے کبھی صافے کا تکلف روا نہیں رکھا۔ وہ اپنی مخصوص (غیر عالمانہ) ٹوپی پہنتے تھے اور بڑے بڑے علما اُن کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے اور پھر انقلاب آیا تو دیوبند کے مشاہیر علما کو ہم نے گاندھی کیپ بر سر بھی دیکھا۔ یہی حال پاجامے کا ہے۔ ایک دور وہ بھی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایک خاص قسم کی شلوار کو

---

[1] زی = وضع قطع، سج دھج

شرعی پاجامہ کہا جاتا تھا اور علی گڑھ کاٹ پاجامہ علما کے لئے معیوب و ممنوع تھا، لیکن بتدریج وہ بھی رائج ہوگیا۔ اسی صدی کے آغاز میں انگرکھے کی جگہ اچکن یا شیروانی پہننے والوں کو فیشن ایبل کہا جاتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ ہم تو زی امرا اور زی علما کے فرق سے واقف نہیں ہیں۔

اگر زی امرا سے ان حضرات کی مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دولتِ علم کے ساتھ دولتِ دنیا سے بھی بہرہ مند ہونے کی بنا پر تحدیث نعمت کرتا ہے اور شایانِ شان لباس پہنتا ہے تو یہ فرمایا جائے کہ یہ کس امام کے نزدیک حرام ہے؟ ہم نے امام الائمہ ابوحنیفہ، امام ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ وغیرہ متعدد اکابر و ائمہ کے متعلق پڑھا ہے کہ وہ نہ صرف صاف ستھرا بلکہ اعلیٰ درجے کا لباس پہنتے تھے۔ خود نواب صدیق حسن خاں کے متعلق متعدد ثقہ حضرات سے لباس کے اہتمام اور غیر شرعی اسباب زینت پر توجہ کے متعلق سنا ہے اور ان کی جو تصویر نظر سے گزری ہے اس میں وہ زی علما کے بجائے زی امرا میں نظر آتے ہیں۔۔۔

- - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - اور شاہ اسماعیل کے لباس کے متعلق تو جعفر تھانیسری[۱] نے لکھا ہے کہ وہ ہمہ سپاہیانہ وضع رکھتے تھے۔ گلے میں الخالک اور چست پاجامہ، سر پر پیچیدہ عمامہ اور گلے میں تلوار حمائل کئے رہتے تھے۔

۱۔ سوانح احمدی طبع کراچی ص ۱۳۱

دوسری بات نواب صاحب نے یہ فرمائی ہے کہ[1]

وکان بینہ وبین استاذی العلامۃ محمد صدر الدین خان الدھلوی بھا مودۃ اکیدۃ ومحبۃ شدیدۃ لانھما کانا شریکین فی الاشتغال علی استاد واحد وعلی ابیہ الفاضل فضل امام ومع ذلک یسخط استاذی علیہ فی بعض امورہ منھا ردہ علی الشیخ الحافظ الواعظ المحدث الاصولی الحاج الغازی الشھید محمد اسماعیل الدھلوی و یقول لا ارضی منک ولیس ھٰذا یعنیک

مولینا فضل حق اور میرے استاد علامہ محمد صدر الدین خاں دہلوی کے درمیان بڑی دوستی اور محبت تھی، اس لئے کہ دونوں ایک استاد کے شاگرد تھے اور مولینا فضلِ حق کے فاضل والد (مولینا) فضل امام کے بھی دونوں شاگرد تھے، مگر اس کے باوجود میرے اُستاد مولینا فضل حق کو انکے بعض کاموں پر برا بھلا کہا کرتے تھے، اُن میں سے ایک یہ تھا کہ مولینا فضل حق نے حضرت حافظ واعظ محدث اصولی حاجی غازی شہید محمد اسماعیل دہلوی کا رَد کیا تھا۔ استاد اُن سے فرمایا کرتے تھے کہ میں تمہاری اس بات سے خوش نہیں ہوں اور یہ تمھیں زیب نہیں دیتی۔

ایک دوست کا دوسرے کو ٹوکنا تو کوئی نئی بات نہیں ہے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ مولینا آزردہ تو مولینا فضل حق کو

---

[1] ابجد العلوم بحوالہ نزہتہ الخواطر، الجزء السابع، ص ۲۷۶

اس بات پر بُرا بھلا کہیں کہ انھوں نے شاہ اسماعیل کا رَد کیا تھا جب کہ

(۱) خود وہ شاہ اسماعیل کے خیالات سے متفق نہیں تھے اور بقول مولٰینا فضل رسول انھوں نے شاہ صاحِب کو سمجھا کر اس سے باز رکھنا چاہا تھا۔

(۲) مولٰینا آزردہ یقین یومِ میلاد کے قائل تھے۔

(۳) مولٰینا قیام فی المیلاد کو بھی مستحسن جانتے تھے۔

(۴) "منتہی المقال" میں بھی وہ وہابی نقطہ نظر کے خلاف گئے ہیں اور جوش و خروش کے ساتھ وہابیہ کا رَد کیا ہے۔

(۵) امتناع نظیر کے باب میں بھی ان کا ایک قلمی رسالہ میرے کتبخانہ میں ہے، وہ اِس میں بھی شاہ صاحب سے کلیتہً متفق نہیں تھے۔

اِن حقائق کی موجودگی میں مَیں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ نواب صاحِب کا اپنے اُستاد پر افترا ہے کہ وہ مولٰینا فضل حق سے اِس لئے ناراض تھے کہ انھوں نے شاہ صاحب کا رَد کیا تھا اور مولٰینا فضلِ حق کے سلسلے میں لوگوں کو بدگمان کرنے کی ناکام کوشش ہے۔

لطف یہ ہے کہ یہی نواب صاحب جو ردِ وہابیت پر مولٰینا فضلِ حق سے اس درجہ برہم تھے، خود وہابیہ خصوصًا وہابیۂ ہند سے مسلسل اظہارِ برأت کرتے رہے اور بقول مولٰینا مسعود[علہ] عالم ندوی "اہل نجد کی بھی کوئی برائی نہیں ہے جو انھوں نے اپنی

علہ معارف اعظم گڈھ جلد ۱۵ شمارہ ۳، مارچ ۱۹۴۳ء

کتابوں میں نہ کی ہو۔۔۔۔ کچھ یہی حال اہل صادق پور (شاہ اسماعیل کے متبعین و مقلدین) کے ساتھ ہے"۔

اور اس تبرّا کی توجیہہ مولٰینا نے یہ کی ہے کہ وہ حکومتِ برطانیہ کے خوف سے خود کو وہابیانِ ہند سے بے تعلق دکھانا چاہتے تھے ورنہ دل سے نجد کی دعوت توحید کے معترف و ثنا خواں تھے۔ مولٰینا ندوی نے توقع ظاہر کی ہے کہ

"جو لوگ ان کی زندگی کی الجھنوں سے واقف ہیں وہ انھیں معذور رکھیں گے"۔[۱]

دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ نواب صاحب نے اپنی منقولۂ بالا عربی تحریر میں شاہ اسماعیل کو غازی و شہید لکھا ہے، مگر اپنی کتاب ترجمان وہابیہ میں شاہ اِسماعیل کے دامن سے ترغیبِ جہاد کے داغ دور کیے ہیں اور لکھا ہے کہ "انھوں نے اپنی کسی کتاب میں مسئلہ جہاد کا نہیں لکھا"[۲] اور شاہ اسماعیل سے عقیدت اور ان کی اتباع سے تبری کی ہے[۳] اور پوری کتاب میں کسی ایک جگہ بھی شاہ اسماعیل کے نام کے ساتھ شہید کا لفظ نہیں لکھا اور بتکرار لکھا ہے کہ غدر میں انگریزوں کے خلاف جو بھی ہنگامہ آرائی ہوئی اور فتوے لکھے گئے وہ سب مقلدین اور احناف کی شرارت تھی، وہابی اور اہلِ حدیث کا

---

[۱] معارف، اعظم گڈھ، جلد ۵۱ شمارہ ۳، مارچ ۱۹۴۳ء [۲] ترجمان وہابیہ ص ۱۱، ص ۵۰، ص ۵۴ مطبع محمدی لاہور ۱۳۱۲ھ [۳] ایضاً ص ۱۲ و ص ۵۱

دامن اس بغاوت میں شرکت سے بالکل پاک ہے[1]

(۲)

منشی محمد جعفر تھانیسری سوانح احمدی میں لکھتے ہیں[2]:

"مولوی فضل حق معقولی خیرآبادی جو اس زمانے میں حاکم اعلیٰ شہر کے سررشتہ دار اور علم منطق کے پتلے اور افلاطون و سقراط و بقراط کی غلطیوں کی تصحیح کرنیوالے تھے، مولینا شہید کے سخت مخالف ہو گئے، چناں چہ کتاب تقویت الایمان کے اس مسئلے پر کہ "اللہ رب العزت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سا دوسرا پیدا کر دینے پر قادر ہے" انھوں نے سخت اعتراض کیا اور لکھا کہ "اللہ رب العزت حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسا دوسرا پیدا کرنے پر ہرگز قادر نہیں"۔ اس کے جواب میں مولینا (اسماعیل) نے ایک فتویٰ بدلائل عقلی و نقلی مدلل لکھا ہے... اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس خوبی سے آپ نے مخالفوں کا منھ بند کیا ہے"

مخالفین کا منھ تو بند نہیں ہوا، دین میں جو فتنہ پیدا ہو گیا اور قلب امت میں قادیانیت کا جو ناصور پیدا ہو گیا اس کا علاج منظر

---

[1] ترجمان وہابیہ ص۲۵ و مابعد

[2] طبع کراچی ۱۹۶۸ء ص۳۰۴

نہیں آتا۔

شاہ اسماعیل کی اِس تحریر پر مولٰینا فضل حق نے یہ اعتراض کیا تھا کہ نظیر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا امکان تسلیم کر لینے سے ختم نبوت کا انکار لازم آتا ہے، مگر شاہ صاحب کو اپنی بات پر اصرار رہا اور پھر ان کی حمایت میں مولوی حیدر علی رام پوری نے ان سے بھی بڑھ کر بات کہی کہ حضور اکرمؐ ممکن ہے ان (ہمارے) ارض و سما کے خاتم النبیین ہوں اور وہ مفروض مثیل خاتم النبیین کسی دوسرے ارض و سما اور کسی اور دنیا کا خاتم النبیین ہو۔[1] ان حضرات نے اثر ابن عباس سے استدلال کیا جو ایک موضوع روایت اور از قبیل اسرائیلیات ہے۔ اس روایت میں سات زمینوں کے وجود اور ان ساتوں زمینوں میں ہماری زمین کے انبیا اور خاتم النبیین (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی طرح الگ الگ ہر زمین میں دوسرے انبیا اور خاتم النبیین کا ذکر ہے، گویا اس طرح یہ حضرات امکان نظیر کے اثبات کی دُھن میں سات زمینوں کے سات خاتم النبیین ثابت کرنے پر تل گئے اور اس طرح نادانستہ ہی انکار ختم نبوت کی راہ ہموار ہوئی اور مرزا غلام احمد قادیانی کو یہ جرأت ہوئی کہ وہ نبوت کا ادعا[2] کرے، چنانچہ مرزا کے خلیفہ مرزا بشیر احمد نے مولٰینا محمد قاسم نانوتوی کے رسالہ تحذیر الناس کی (جو اثر ابن عباس

---

[1] صیانۃ الناس من وسوسۃ الخناس بحوالہ امتناع النظیر ص ۱۵۶ ۔

[2] مولٰینا محمد قاسم نے ۱۸۷۳ء میں رسالہ تحذیر الناس لکھا اور ۱۸۸۰ء میں مرزا نے اپنے ملہم اور مجدد ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

کی صحت کے حق میں ہے) ایک عبارت نقل کر کے لکھا ہے ہے[1]

"اہلِ بصیرت کے نزدیک، اِس شہادت کو خاص وزن حاصِل ہونا چاہیئے۔ یہ شہادت مدرسۃ العلوم دیوبند کے نامور بانی حضرت مولوی محمّد قاسم صاحِب نانوتوی (ف ۱۸۸۹ء) کی ہے۔"

مختصر یہ ہے کہ شاہ اِسماعیل کے غیر محتاط اندازِ بیان اور ایک خاص گروہ کے علما کی طرف سے ان کی بے جا اور ناحق حمایت نے ایک ایسے فتنے کو سر اٹھانے اور پنپنے کا موقع دیا جو ۹۵ سال سے امّت کے لئے دردِ سر بلکہ دردِ جگر بنا ہوا ہے۔ مولینا فضلِ حق کی فراست نے برمحل اس فتنے کا سدِّ باب کرنا چاہا تھا اور شاہ اسماعیل کی کتاب پر بروقت تنقید کی تھی۔

جعفر تھانیسری نے مولینا فضل حق پر ایک اور تہمت یہ تراشی ہے کہ مولینا نے جامع مسجد میں شاہ اسماعیل کا وعظ بند کرا دیا تھا[2]

جعفر تھانیسری نے یہ بات بلا سند لکھی ہے، اس لئے قطعاً ناقابلِ اعتبار ہے۔ وہ شاہ اسمٰعیل کی شہادت (۱۸۳۱ء) کے ایک سال بعد پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۹۵ء میں یہ سوانح لکھ رہے ہیں[3]۔ اس

---

[1] ختمِ نبوت کی حقیقت ص ۱۵۴ طبع کراچی [2] سوانح احمدی (حیات سیّد احمد شہید) ص ۳۵ طبع کراچی [3] یہ سال طباعت ہے۔ تالیف دو ایک سال قبل کی ہوگی۔

لئے بغیر کسی سند کے اس کی بات کا اعتبار کیسے کیا جا سکتا ہے خصوصاً اس لئے کہ تحریکِ جہاد کے معاصر مورخین میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں لکھا کہ شاہ صاحب کے وعظ کی مخالفت میں مولٰینا فضلِ حق کا ہاتھ تھا۔

یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ جعفر تھانیسری وہ بزرگ ہیں جو بغاوت اور تحریکِ مجاہدین میں شرکت کے جرم میں ماخوذ ہو کر انڈمان بھیج دیئے گئے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں اس وقت رہا ہوئے جب وہابیوں کے متعلق انگریزوں کی پالیسی بدلی اور وہابیوں اور انگریزوں کے درمیان مراسلات کے تبادلے اور معاہدے بھی ہوئے۔ منشی جعفر نے رہائی کے بعد سوانحِ احمدی کے نام سے سیّد احمد شہید اور ان کی تحریک پر جو کتاب تالیف فرمائی وہ تحریک کے لئے نہایت مضر اور بدگمانیوں کا باعث ہوئی۔ مولٰینا غلام رسول مہر نے ثابت کیا ہے کہ منشی جعفر نے سیّد صاحب کے مکاتیب میں عبارتوں میں ترمیم و تحریف کی اور جہاں جہاں انگریز لکھا تھا وہاں سکھ کر دیا۔[1] اس تحریف نے تحریک کو طرح طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا کر دیا اور منشی جعفر نے وہ کارنامہ انجام دیا جو بدترین دشمن کے بس کا نہ تھا۔

مولٰینا فضلِ حق کے ایک اور کرم فرما مرزا حیرت دہلوی تھے۔ ان حضرت نے شاہ اسماعیل کے سوانح پر حیاتِ طیبہ کے نام سے جو کتاب بیسویں صدی کے آغاز میں تحریر کی تھی اس میں متعدد مقامات

---

[1] سیّد احمد شہید ص ۱۵۹

پر مولینا فضل حق کا ذکر خیر کیا ہے اور متعدّد گھناؤنے اور بے بنیاد الزامات مولینا پر لگائے ہیں اور کئی غلط بیانیاں کی ہیں :

(۱) مولینا فضل حق "زمرۂ علمائے دینی کے پابند نہیں تھے" اور انھوں نے اپنے کو دائرۂ علما سے خارج کر لیا تھا"[۱]۔ اس سلسلے میں ہم آپ کو نواب صدیق حسن خاں کا وہ قول یاد دلائیں گے کہ "مولینا فضل حق کی وضع قطع امرا کی سی تھی علما کی سی نہیں تھی"۔ اور ہمارا جواب یہاں بھی یہی ہوگا جو ہم نواب صاحب کی بات کا دے چکے ہیں۔ یہاں ہم آپ کو اپنی وہ بات بھی یاد دلائیں گے کہ مولینا فضلِ حق کے متعلق ایسی تہمتیں زیادہ تر اہل حدیث کے گروہ نے تراشی ہیں۔ چناں چہ آپ دیکھ رہے ہیں نواب صدیق حسن خاں، منشی جعفر تھانیسری اور مرزا حیرت کے انداز تہمت تراشی میں کس قدر یکسانی و یک رنگی ہے۔ مرزا حیرت بھی اہلِ حدیث اور عدم تقلید کے مبلغ تھے۔

(۲) مولینا فضل طوائفوں کے یہاں جایا کرتے تھے[۲]۔ مرزا حیرت مولینا کے معاصر نہیں تھے، اس لئے ان کو کسی معاصر کے تذکرے کا حوالہ دینا ضروری تھا، حوالے کے بغیر اتنے عرصے بعد کوئی نئی بات کیسے قبول کی جا سکتی ہے!

(۳) منشی جعفر تھانیسری کا یہ الزام مرزا حیرت نے بھی دہرایا ہے کہ "مولینا فضل حق نے شاہ اسماعیل کا وعظ بند کردا دیا تھا" بلکہ منشی جعفر

---

[۱] حیاتِ طیبہ ص۱۰۱ طبع سوم ۱۹۵۸ء لاہور [۲] ایضاً ص۱۰۱

کے اجمال کو تفصیل کا رنگ دے کر کئی صفحات سیاہ کئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مولینا نے پہلے تو ریزیڈنٹ کے کان میں یہ بات ڈالی کہ شاہ صاحب کے مواعظ سے امن عامہ میں خلل کا اندیشہ ہے، پھر ایک عرضی پندرہ سو مسلمانوں کے دستخط سے ریزیڈنٹ کو شاہ صاحب کے خلاف دلوائی جس پر ریزیڈنٹ نے حکم دے دیا کہ شاہ صاحب کا وعظ بند کر دیا جائے۔ شاہ صاحب تک یہ حکم پہنچا تو انھوں نے اس کے جواب میں ایک ایسی درخواست لکھی جس سے ریزیڈنٹ کی رائے بدل گئی اور اس نے اجرائے مواعظ کا حکم دے دیا مگر مولینا نے یہ حکم شاہ صاحب کو نہیں پہنچایا۔ شاہ صاحب چند روز انتظار کے بعد خود ریزیڈنٹ کے پاس پہنچ گئے اور اپنی درخواست کے جواب کا مطالبہ کیا۔ ریزیڈنٹ کو یہ معلوم کر کے کہ اس کا حکم شاہ صاحب تک نہیں پہنچایا گیا بہت طیش آیا اور اس نے مولینا کو زجر و توبیخ کی اور تین ماہ کے لیئے معطل کر دیا[۱]۔ اس کے جواب میں اولاً تو ہم پھر اپنا وہی مطالبہ دہرائیں گے کہ آپ کا ماخذ کیا ہے؟ ثانیاً مرزا حیرت نے لکھا ہے کہ جس سال یہ واقعہ پیش آیا "یہ مولینا کی عمر کا بتیسواں سال تھا" (ص۱۳۴)۔ شاہ اسماعیل کا سالِ ولادت ۱۱۹۳ھ ہے اس لئے ۱۲۲۵ھ میں ۳۲ سال کے ہوتے ہیں اور مولینا فضل حق جن کا سالِ ولادت ۱۲۱۲ھ ہے اس وقت صرف ۱۳ سال

---

[۱] ایضاً ص۱۳۳

کے ہوں گے یا یوں سمجھئے کہ شاہ صاحب مولینا سے ۱۹ سال بڑے تھے اس لئے جب شاہ صاحب ۳۲ سال کے ہونگے اس وقت مولینا کی عمر ۱۳ سال ہو گی۔ اس عمر میں وہ زیرِ تعلیم تھے نہ کہ ریذیڈنٹ کے سر رشتہ دار!

(۴) مرزا حیرت نے لکھا ہے کہ مولینا فضل حق کی نظم و نثر پر مولوی امیر احمد صاحب مرحوم نے تیرہ سو اعتراض کئے تھے اور مولینا سید احمد رامپوری نے ان تیرہ سو اعتراضات کو ایک رسالے کی صورت میں مرتب کر کے اس کا نام "تیرہ صدی" رکھا تھا (ص ۱۰۰)

مرزا حیرت کا یہ بیان اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقت میں مبالغے کا عنصر شامل کر دینے میں چابک دست واقع ہوئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک اہلِ حدیث عالم شمس العلما مولوی امیر احمد سہسوانی نے مولینا فضل حق کی کتاب الہدیۃ السعیدیہ وغیرہ پر دس اعتراضات "تلك عشرة كاملة" کے نام سے ایک رسالے میں لکھے تھے اور مولوی سید محمد نذیر نے رامپور میں یہ رسالہ طبع کروایا تھا۔[1] دس کو تیرہ سو لکھ کر مرزا حیرت نے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کی تحریر میں صداقت کا عنصر بلبلہ ہوتا ہے۔

دہلی کے نامور ثقہ بزرگ ملا واحدی تحریر فرماتے ہیں[2]:

"مرزا حیرت وہی بزرگ ہیں جنھوں نے سیدنا حضرت

عـلہ حیواۃ العلماء ص ۲۷ مؤلفہ مولینا عبدالباقی سہسوانی طبع ۱۹۲۲ء

عـ۲ـہ میرے زمانے کی دلی ص ۱۸۸ طبع اوّل

امام حسینؓ کے کارنامۂ شہادت سے انکار کیا تھا اور
انکار پر ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔ کمال یہ تھا کہ جس زمانے
میں انکارِ شہادت پر کتاب تصنیف کر رہے تھے،
اس زمانے میں جمعہ کے جمعہ شہادت پر تقریریں کیا
کرتے تھے اور ایسی تقریریں کرتے تھے کہ سننے والوں کی
ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔"

خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:[1]

"وہ (مرزا حیرت) فرضی عبارتیں و فرضی حکایتیں اور
فرضی حوالہ جات تاریخ کی کتابوں میں درج کردینے
میں مشہور ہیں اور ان کی دلیری اور جھوٹ بولنے اور
جھوٹ لکھنے کی بے باکی پر شمس العلما علامہ شبلی
نعمانی تک حیرت زدہ رہتے تھے۔"

خواجہ صاحب کے اس بیان کا جیتا جاگتا ثبوت مرزا حیرت کی کتاب
حیاتِ طیبہ ہے۔ اس کتاب کے ماخذ کی اصلیت و واقعیت کا
یہ حال ہے کہ متعدد مقامات پر تو اس نوع کے مہمل و مجمل حوالے ہیں
"ایک کتاب" (ص ۴۷)، "ایک راوی" (ص ۹۰)، "ہمعصر مورخ"،
ص ۱۸۸، "ہم عصر سوانح نویس" ص ۲۷۷، "ایک ضعیف بوڑھا شخص
مرحوم" ص ۲۹۵، "ہمارا مورخ" (ص ۶۱)۔ ایک اہم ماخذ منشی ہیرالال

---

[1] "غدرِ دہلی کے اخبار" (مرتبہ خواجہ حسن نظامی ص ۶ مطبوعہ ۱۹۲۳ء دہلی

کے بیانات ہیں۔ ۵ اہم مواقع پر اس کے حوالے دیے ہیں اور اسے شاہ اسماعیل کا منشی بتایا ہے (ص۱۲۳)۔ شاہ صاحب کے کئی صفحات پر محیط مواعظ و مکالمات اس کی روایت سے نقل کیے ہیں، حال آں کہ شاہ صاحب کے کسی تذکرے میں یہ نام ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اسی طرح چند ایسی کتابوں کے حوالے بھی اس کتاب میں نظر سے گزرے جن کے نام بھی کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئے مثلاً سیر دہلی (۵ مقامات پر) تذکرہ مشاہیر دہلی (۳ مقامات پر) تواریخ علمائے دہلی (۳ مقامات پر) مجموعۂ واقعات (۶ مقامات پر) تحفۂ عزیزی (۳ مقامات پر)۔ بکثرت انکشافات بھی کیے ہیں، مثلاً یہ کہ شاہ اسمٰعیل نے "حقیقت تصوف" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جو مرزا صاحب نے کشمیر میں دیکھی بھی تھی (ص۱۶۷)۔ شاہ اسماعیل کے معاصر مورخ کتنے بے خبر تھے کہ انھوں نے اسی شاہ صاحب کی ایک ضخیم کتاب کی زیارت نہیں کی۔

کتاب کا موضوع شاہ اسماعیل اور تحریکِ جہاد ہے اور بظاہر بڑی عقیدت سے لکھی گئی ہے مگر در حقیقت مرزا حیرت نے منشی جعفر سے زیادہ تحریکِ جہاد کے ساتھ جہاد کیا ہے اور ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ فرطِ عقیدت کا مظاہرہ کر کے بہت سی بے سر و پا، بے اصل اور خلافِ واقعہ باتیں لکھ دی ہیں اور شاہ اسماعیل اور سید احمد شہید سے ایسے ایسے اقوال و افعال منسوب کر دیئے ہیں جو گمراہ کن اور شدید سوءِ ظن کا منشا ثابت ہوئے ہیں اور سوانح نگار کے

عقیدت مندانہ اندازِ نگارش کی موجودگی میں ان کی تردید بھی قابل قبول نہیں ہوتی۔ تحریک کا ہدف انگریز نہیں سکھ تھے (۵۲۲) غلام علی رئیس الٰہ آباد کا واقعہ (۵۲۳) اور اسی قسم کے دوسرے افسانے تحریک سے بدظن کرنے کے لئے کافی ہیں اور منشی جعفر سے زیادہ موثر انداز میں بیان کیئے گئے ہیں اور مجھے تو اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا کہ انگریزوں نے تحریکِ مجاہدین کو بدنام کرنے کے لئے ظلم کا یہ نیا اسلوب اختیار کیا تھا کہ منشی جعفر اور مرزا حیرت سے عقیدت مندانہ سوانح عمریاں لکھوائیں اور ان میں جی بھر کر بدنام کیا گیا اور مولینا فضلِ رسول بدایونی کی تنقیدیں وہ کام نہ کر سکیں جو منشی جعفر اور مرزا حیرت کے قصائدِ مدحیہ نے کیا۔

سید صاحب کے متعلق دعویٰ کیا ہے کہ امیر خاں کی انگریزوں سے صلح سید صاحب نے کروائی تھی (۵۱۳-۵۱۴)

اپنی باتوں کو موثر بنانے کے لئے خود کو بھی غیر مقلد، شاہ صاحب کا ہم مسلک ظاہر کیا ہے۔ عدم تقلید کی تبلیغ زور شور سے کی ہے۔ غیر مقلدین کو بھی محمدّی لکھا ہے اور محمدّ بن عبدالوہاب کے متبعین کو بھی محمدّی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جس پیرائے میں محمدیوں کو جنھیں سخت غلطی سے وہابی کہا جاتا ہے، انگریز مصنفوں نے گورنمنٹ کو دکھایا ہے سخت حیرت انگیز کارروائی ہے۔ گورنمنٹ خود

جانتی ہے کہ اس کی سلطنت کے قانون کو فرقہ اہلِ
حدیث نے کس قدر تسلیم کیا ہے اور اس (گورنمنٹ)
کے فرماں بردار اور مطیع اس گروہ (اہل حدیث)
کے لوگ ہیں ص۳۹۳۔

شاہ اسماعیل کے لیئے لکھا ہے کہ "انھوں نے امام ابوحنیفہ سے
زیادہ دین کی خدمت کی" (۵۲۵) یہ مدح وسپاس کا وہ انداز ہے
جو ممدوح کو مبغوض بنا دیتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ کرزن گزٹ کے اس مدیر شہیر اور برطانوی حکومت
کے اس "ملک الشعرا" نے برطانوی حکومت کی مدحت کا یہ اسلوب
بدیع اختیار کر لیا تھا اور تحریکِ مجاہدین پر تنقید کا ایک نیا طرز اختیار
کیا تھا اور اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ آج تحریک مجاہدین
کے نقّادوں اور نقاصوں کے لیئے یہ کتاب بڑا سہل ماخذ ہے۔

مولانا سیّد عبدالحیٔ حسنی (صاحب نزہتہ الخواطر) نے ۱۸۹۴ء
میں سرگروہ اہلِ حدیث میاں سیّد نذیر حسین کی زبانی ایک روایت
سن کر اپنے سفرنامے (دہلی اور اس کے اطراف) میں من وعن بے نقد و
جرح درج کر دی تھی۔ یہ روایت بھی اسی مہم کا ایک حصّہ ہے جس کے
ذریعے مولانا فضل حق کے دامنِ کردار پر معائب کی افشاں چھڑکی جا
رہی ہے پہلے آپ روایت سُن لیں۔ میاں سیّد نذیر حسین نے مولانا
سید عبدالحیٔ سے فرمایا [1]:

[1] دہلی اور اس کے اطراف ص۳۲

"مولوی فضل حق، صاحب ایک شادی میں شریک تھے، گرمیوں کے دن تھے۔ پلاؤ کھایا ہوگا (؟) ناچ رنگ ہوتا رہا۔ جس مکان کے بالا خانے پر یہ جلسہ تھا وہاں جتنے ظرف پانی کے تھے سب میں کسی نے جمال گوٹہ ملا دیا اور آمد و شد کا راستہ بند کر دیا یعنی زینے کے دروازے میں باہر سے قفل لگا دیا۔ وہاں پلاؤ کھانے کی وجہ سے پیاس کی شدت سے لوگ خوب پانی پیتے رہے اور دست آنے شروع ہوئے۔ حاضرین و اربابِ نشاط سب اس مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ راستہ بند ہونے سے اور پریشانی پھیلی۔ وہیں سب اپنی اپنی حالت میں تھے اور شدتِ گرمی سے پانی پیتے جاتے تھے۔ کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ اس پانی میں زہر گھلا ہوا ہے۔ رات کو جو پولیس کے جوان روند میں ادھر آ نکلے تو شور و غل سن کر اوپر چڑھے، دروازہ توڑا تو لوگوں کی یہ حالت دیکھی۔ ان میں مولوی (فضل حق) صاحب بھی تھے۔ جیسی کچھ خفت ان کو ہوئی وہ ظاہر ہے"

میاں نذیر حسین کتنے ہی ثقہ راوی کیوں نہ ہوں، عقل اسے باور کرنے پر آمادہ نہیں ہے اور درایت کا فیصلہ یہ ہے کہ ایک ان ہونی

بات ہے، کہانی ہے، فسانہ ہے، حقیقت نہیں ہے۔ اگر ہم روایت کو حقیقت پر مبنی فرض کریں گے تو اس کے ساتھ متعدد مفروضات کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ سب سے پہلے تو ہمیں اکبر شاہ ثانی کی دلّی میں، شاہ عبدالعزیز کے دور کی دلی میں اور غدر سے ۳۰ سال پہلے کی دلّی میں ایک ایسا شریف النفس اور باہوش میزبان فرض کرنا ہوگا جو اپنی اولاد کی شادی میں مدعو معززین کے ساتھ ایسا گھناؤنا، پُرخطر اور ناشائستہ مذاق کر سکتا ہو یا دوسرے مذاق کرنیوالے "شرفا" کے ساتھ اس حد تک اغماض کر سکتا ہو کہ وہ اس کے معزز مدعووین کے ساتھ جو چاہیں معاملہ کریں اور خود جاکر بستر پر دراز ہو جائے، پھر ایک ایسا بالاخانہ فرض کرنا ہوگا جو اولاً تو اتنا وسیع ہو کہ اس میں سرود و غنا کی محفل برپا کی جا سکے۔ ثانیاً موسم گرما میں ایسی محفل کے لئے بھی موزوں ہو، ہوادار ہو۔ ثالثاً اس میں آمد و رفت کا صرف ایک راستہ ہو، جسے مقفّل کر دیا جائے تو وہ بالاخانہ دنیا سے منقطع ہو جائے۔ رابعاً وہ کسی دوسری عمارت سے متصل نہ ہو، تاکہ اس میں محبوس و محصور حضرات کی آواز بھی برابر والے سُن نہ سکیں۔ خامساً اس میں کوئی دریچہ اور روشن دان تک نہ ہو کہ اس کے ذریعے محلے والوں سے رابطہ قائم کیا جا سکے اور استعانت کی جا سکے، پھر یہ بھی فرض کرنا ہوگا کہ اُن شرکائے بزمِ نشاط میں سے ہر فرد بلا استثنا اتنا قوی الاعضا بلکہ سخت جان تھا کہ شدید موسم میں پلاؤ کھانے کے بعد جمال گوٹے کا محلول گھنٹوں

مسلسل پیتا رہے اور مبتلائے اسہال رہے، مگر ان میں سے ایک فرد کے
بھی جان و تن کا رشتہ منقطع نہیں ہوا بس صرف مولوی فضل حق صاحب
کو خفت ہو کے رہ گئی۔

مولینا سید عبدالحیٔ نے نزہتہ الخواطر کے جزء سابع میں بھی مولینا
فضلِ حق کے ساتھ اپنے تعلق خاطر کا ثبوت دیا ہے اور نواب صدیق
حسن خاں کے تنقیصی کلمات نقل کرنے کے ساتھ خود بھی لکھا ہے کہ [۱]

"ان کی وضع قطع علما کی سی نہیں تھی، امرا کی سی تھی شطرنج
کھیلنے اور مزامیر سننے اور مجالِس رقص میں شرکت اور
دوسری ممنوع باتوں سے بھی پرہیز نہیں کرتے تھے"

آپ کو یاد ہوگا کہ وضع قطع کی بات نواب صدیق حسن سے منقول
ہے اور سماع و مزامیر اور مجالس رقص میں شرکت کا اتہام میاں نذیر
حسین کے معمل میں ڈھالا گیا ہے اور ہم ان کا جواب دے چکے ہیں اور
یہ ثابت کر چکے ہیں کہ یہ باتیں حقیقت نہیں تہمت ہیں، اِس کے برعکس
اُن کے تلمیذ مولانا عبداللہ بلگرامی کا بیان یہ ہے کہ [۲]

"ہر ہفتے قرآن کریم کا ختم فرماتے، تہجد کی نماز پابندی
سے پڑھتے اور جو نوافل کا اتنا اہتمام کرتا ہو اس کے
ادائے فرائض کا خود اندازہ کر لو"

---

[۱] نزہتہ الخواطر الجزء السابع ص ۲۷۵ [۲] خطبۂ ہدیۂ سعدیہ

مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں[1]:

"مولوی فضلِ حق صاحب مرزا (غالب) کے بڑے دوست تھے۔ ایک دن مرزا ان کی ملاقات کو گئے۔ ان (مولانا) کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آیا کرتا تو خالق باری کا یہ مصرع پڑھا کرتے تھے؛ بیا برادر آؤرے بھائی۔ چناں چہ مرزا صاحب کی تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے اور یہی مصرع کہہ کر بٹھایا ابھی بیٹھے ہی تھے کہ مولوی فضلِ حق صاحب کی رنڈی بھی دوسرے دالان سے اٹھ کر پاس آن بیٹھی۔ مرزا نے فرمایا' ہاں صاحب اب وہ دوسرا مصرع بھی فرما دیجیے بِنشیں مادر بیٹھ ری مائی!"

اِس لطیفے کا صحیح واقعہ مرزا غالب کی بہن کے پوتے نواب سرور جنگ نے اپنی خود نوشت میں اِس طرح درج کیا ہے[2]:

"مرزا غالب کی مولانا فضلِ حق سے کمال دوستی تھی۔ ہر شب کو معمولاً مرزا مولانا کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک شب کو مولانا جو سررشتہ دار ریزیڈنٹ تھے، باہر صحن میں بیٹھے ہوئے کچھ مثلیں دیکھ رہے تھے، ایک

---

[1] آبِ حیات ص۲۲۷ [2] کارنامہ سروری ص۷۳۔ بحوالہ غالب نام آورم از جناب نادم سیتاپوری، مولانا آزاد کی اس تہمت کا جواب نادم صاحب کے محققانہ مقالے سے ماخوذ ہے۔

رنڈی بھی اس امر کی منتظر کہ مولٰینا دیکھ لیں تو سلام کر کے بیٹھ جاؤں۔ کھڑی ہوئی تھی، اِس عرصے میں مرزا بھی لالٹین لئے آگے آگے پہنچے۔ مولٰینا نے سر اٹھا کر کہا کہ بیا برادر آ ؤ رے بھائی۔

مرزا نے کہا، دوسرا مصرع بھی پڑھ دیجیے کہ دیر سے منتظر کھڑی ہے۔ دوسرا مصرع یہ ہے "بنشیں مادر بیٹھ ری مائی"

ہنومان گڑھی (اجودھیا) کی مسجد بابری کی بے حرمتی کے سلسلے میں ۱۸۵۵ء میں مولوی امیر علی امیٹھوی کی قیادت میں مسلمانوں نے جو جہاد کیا تھا بعض مورخین کا بیان ہے کہ مولٰینا فضل حق اس جہاد کے عدم وجوب کا فتویٰ دینے والے علما میں شامل تھے، لیکن یہ واقعہ نہیں ہے۔ یہ الزام صرف سید کمال الدین حیدر نے عائد کیا ہے، جو انگریزوں کے خاص آدمی تھے اور جنھوں نے مسٹر الیٹ (مشہور مورخ) کی فرمائش پر اودھ کی تاریخ قیصر التواریخ مرتب کی تھی اور اسی تاریخ کی بنا پر وہ واجد علی شاہ کے معتوب اور ملازمت سے برطرف ہوئے تھے اور اسی الزام کو مولوی نجم الغنی خاں نے برسوں بعد اپنی تاریخ اودھ (مطبوعہ ۱۹۱۹ء) میں من وعن[1] نقل کر دیا۔

---

[1] پورے پیراگراف میں صرف یہ فرق ہے کہ "صاحبان عالی شان یا اہلِ اسلام" کے بجائے نجم الغنی خاں نے "انگریز یا مسلمان" کر دیا ہے (ملاحظہ ہو مقالۂ پروفیسر محمد ایوب قادری اخبار انجام کراچی ۸ نومبر سنہ ۱۹۶۲ء)۔

مسجد پر ہندوؤں کے قبضے اور قرآنِ کریم کی بے حرمتی کے خلاف جب جہاد کی تحریک شروع ہوئی اودھ کی حکومت نے اس کی مزاحمت کے لیے علما کی خدمات حاصل کیں اور ایک استفتا مرتب ہوا جس کے جواب میں علما نے مجاہدین کے مقابلے میں حکومت کے نقطۂ نظر کی تائید کی۔ اِس فتوے پر دستخط کرنے والے علما میں سید کمال الدین نے مولانا فضل حق کا بھی نام لیا ہے (ص۱۲۵ قیصر التواریخ جلد دوم طبع ۱۹۰۷ء)، مگر لطف یہ ہے کہ اِسی کتاب میں ص۱۱۱ پر جہاں وہ فتوے نقل کیا ہے اس پر مولوی محمد یوسف، مولوی احمد اللہ، مولوی خادم احمد، مولوی محمد سعد اللہ، مولوی تراب علی کے دستخط ہیں، مولانا فضلِ حق کے نہیں ہیں۔ مولوی نجم الغنی خاں نے بھی تاریخ اودھ میں یہ فتویٰ نقل کیا ہے، مگر یہاں بھی مولانا کے دستخط نہیں ہیں۔ حدیقۃ الشہدا میں بھی جو مولوی امیر علی امیر المجاہدین کے ایک رفیق کی تالیف ہے اور اُسی سال شائع ہوتی تھی[1]، علما کے فتوے درج ہیں لیکن مولانا فضل حق کا نہ فتویٰ ہے نہ دستخط، پھر آخر صاحب قیصر التواریخ کا یہ اصل بیان کیسے تسلیم کر لیا جائے، خصوصاً جب کہ انہی کی اسی کتاب میں فتوے پر مولانا کے دستخط نظر نہیں آتے۔

ایک اور معاصر مورّخ مولوی سید فخر الدین نے مہر جہاں تاب[2]

---

[1] یہ نایاب کتاب رئیس احمد جعفری نے اپنی کتاب "واجد علی شاہ اور ان کا عہد" میں کاملاً نقل کر دی ہے (لاہور ۱۹۵۷ء) [2] منقولہ در نزہتہ الخواطر الجز ۷ ص۸۱-۸۲

میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، مگر انھوں نے بھی مولٰینا فضل حق کا نام نہیں لیا -

حدیقۃ الشہدا[1] میں یہ ضرور درج ہے کہ حکومت نے اس سلسلے میں ایک پنچایت بنائی تھی، جس کے چار ثالث مقرر کئے تھے، ان میں سے ایک مولٰینا فضلِ حق بھی تھے، مگر حکومت نے اس پنچایت کی کوئی میٹنگ ہی نہیں بلائی، اِس لئے اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مولٰینا فضل حق کا اس سلسلے میں کس طرف رُجحان تھا؟

---

[1] واجد علی شاہ اور ان کا عہد ص۳۰۰

مولانا فضل حق خیر آبادی اور معرکۂ ہنومان گڑھی

حکیم سیّد محمود احمد برکاتی

مولانا فضل حق خیر آبادی برِّ عظیم پاک و ہند کی ایک عظیم و جلیل اور جامع کمالات شخصیت تھے۔ وہ ایک طرف عقلیات کے امام وقت تھے تو دوسری طرف ایک مدّبر سیاس اور مجاہد حریت تھے۔

ان کے کردار سیاسی کے سلسلے میں جو غلط بیانیاں کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے جہاد ہنومان گڑھی میں مجاہدین کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔ مگر یہ خلافِ واقع ہے۔

جہاد ہنومان گڑھی کی داستان یوں بیان کی گئی ہے۔

یہ واقعہ، ہنگامۂ سن ستاون (۵۷) سے ۱½ سال پہلے (نومبر ۱۸۵۵ء) کا ہے۔ اودھ پر واجد شاہ حکمران ہیں۔ مگر بے اختیار و بے اقتدار، اصل اقتدار برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہے، دارالحکومت لکھنؤ کے قریب ہی ہندوؤں کا ایک مقدس تاریخی مقام اجودھیا ہے اور اسی لئے یہاں ہندوؤں کی اکثریت اور مسلمانوں کی اقلیت ہے۔ مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر نے ۱۵۱۷ء میں یہاں رام چندر کے محل اور سیتا کی رسوئی (مطبخ) کو منہدم کر کے ایک مسجد بنادی تھی۔ مگر اس کے بعد اجودھیا میں مسلمانوں کی قلت تعداد اور مسجد کی حفاظت و آبادی کی طرف سے ان کی غفلت کے نتیجے میں رفتہ رفتہ یہ مسجد خستہ و شکستہ ہوتے ہوتے بے نشان سی ہو گئی تھی۔ پھر ہندو اس کے آثار مٹاتے چلے گئے اور یہاں تک کہ صفدر جنگ

والیٔ اودھ (ف ۱۷۵۴ء) کے عہد میں اس سے متصل انہوں نے
ایک مندر ("ہنومان کی بیٹھک") تعمیر کر لیا پھر ایک چار دیواری بنا کر اس
کو ہنومان گڑھی کہنے لگے، اب بیشتر مسلمانوں کو بھی یہ بات یاد نہ رہی کہ
یہاں ایک مسجد تھی، اس حالت پر کئی برس بیت چکے تھے کہ غلام حسین نامی
ایک صاحب کو اس مسجد کے احیاء کا خیال پیدا ہوا اور وہ اپنے ساتھ
مسلمانوں کی ایک جمعیت لے کر ہنومان گڑھی پہنچے اور آذان دینی چاہی
لیکن بستی کے ہندو اور مندر کے پجاری مزاحم ہوئے اور غلام حسین اور
ان کے رفقاء کو شہید کر دیا اور ان کے گلوں میں جو مصاحف آویزاں تھے۔ ان
کی بے حرمتی کی یہ خبر لکھنؤ پہنچی تو مولوی امیر الدین علی مسلمانوں کے غم و غصہ
کے ترجمان بن کر اٹھے اور مسجد کی باز آبادی کے لیئے جہاد کا نعرہ بلند
کیا۔ مولوی صاحب کے مریدین اور دوسرے سادہ لوح اور دین دار
مسلمان بھی ساتھ ہو گئے اور جہاد کی تیاریاں ہونے لگیں، ایوانِ حکومت
تک اس حادثے اور مسلمانوں کے عزم کی اطلاع پہنچی تو ایک تحقیقاتی
وفد اجودھیا بھیجا گیا۔ جس نے آکر رپورٹ دی کہ مندر کے پاس ایک
مسجد کا ماضی میں وجود دستاویزات سے ثابت ہے، ساتھ ہی اجودھیا کے
مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک مشترکہ اقرار نامہ بھی لکھنؤ پہنچا کہ یہاں
ہندوؤں اور مسلمانوں میں نا اتفاقی اور کسی مسئلے پر اختلاف نہیں ہے
واجد علی شاہ نے ایک مجلس مصالحت تشکیل دی، جو مندر کے مہنتوں، مولوی
صاحب کے نمائندوں اور حکومت کے مقرر کردہ چار ثالثوں پر مشتمل تھی
ساتھ ہی مولوی صاحب کے وجوب جہاد کے نعروں اور مسلمانوں کے اشتعال کے
پیش نظر علماء وقت سے فتویٰ طلب کیا گیا۔ علماء نے فتویٰ دیا کہ موجودہ حالات

میں جہاد و قتال جائز نہیں ہے، خود کو تہلکے میں ڈالنا ممنوع ہے اور جو لوگ اس میں شریک ہوں گے۔ ان کو ثواب نہیں ہوگا" ان فتوؤں کی اشاعت کے بعد مسلمانوں کی ایک تعداد نے تو مولوی صاحب کا ساتھ چھوڑ دیا مگر ایک تعداد نے ساتھ نہیں چھوڑا اور مولوی صاحب انہیں لے کر اجودھیا کی طرف چل کھڑے ہوئے، مجبوراً سرکاری فوج جس کی کمان ایک فرنگی کے ہاتھ میں تھی مزاحم ہوئی میدان گرم ہوا اور مولوی صاحب اور ان کے بہت سے رفقاء شہید کر دیئے گئے (۷، نومبر ۱۸۵۵ء) اس حادثے کے تقریباً تین مہینے بعد واجد علی شاہ کو معزول کر دیا گیا اور اودھ کا الحاق کمپنی سے کر لیا گیا (۴، فروری ۱۸۵۶ء)

اس داستان کو پڑھ کر لازماً یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

بابری مسجد تقریباً سو سال سے تدریجاً ہندوؤں کے تسلّط میں جا رہی تھی۔ اذان و نماز برسوں سے موقوف تھی، مسجد عملاً مندر کا ایک حصّہ بن چکی تھی۔ مگر ۱۸۵۵ء سے پہلے اس طرف کسی نے توجہ کیوں نہیں کی؟

مسلم حکمران کی موجودگی میں (وہ کتنا ہی نااہل کیوں نہ ہو) مسلم رعایا کو بطور خود جہاد کے لیے اُٹھ کھڑا ہونا شرعاً جائز ہے؟

۱۸۵۵ء کے معرکۂ جہاد اور ۱۸۵۶ء کے عزل و الحاق کے بعد بھی مسجد پر ہندوؤں کا ہی قبضہ رہا مگر مولوی امیر الدین علی کی شہادت کے بعد فریضہ جہاد ساقط ہو گیا تھا؟

مولوی امیر الدین علی اور مجاہدین کو واجد علی شاہ کے عہد میں کوئی اور منکر اور خلاف شرع کام نظر نہیں آیا جس کے خلاف جہاد واجب ہوتا؟

سوالات بڑے معقول ہیں، آیئے صحیح صورتِ حال اور اس کے اصل

اسباب پر ایک نظر ڈالیں۔

اودھ پر واجد علی شاہ حکمران تھے مگر ان کا یہ اقتدار محض برائے نام تھا مگر انگریز اپنے مذموم استحصالی مقاصد کی خاطر یہ رہا سہا اقتدار بھی ختم کر دینا چاہتے تھے۔ اور وہ اس کے لیے جواز پیدا کرنے کی فکر و سعی میں تھے اودھ کے ہندو تو پہلے ہی انگریزوں کے ہوا خواہ اور سراپا تعاون تھے مسلمانوں میں سے بھی بہت سے زمانہ شناس اور "دور بین" اور ذہین حضرات، واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ اور مستفید ہونے کے باجود کمپنی کے ساتھ اخلاص و اعانت کا رشتہ استوار کر چکے تھے۔ واجد علی شاہ کے بیشتر حکام اور مصاحبین درپردہ کمپنی کے وفادار اور اس کے تمام اقدامات میں آلۂ کار تھے، یہ گورے اور کالے انگریز مل کر ایسے حالات پیدا کر دینا چاہتے تھے کہ حدود سلطنت میں بدنظمی ہو، عوام میں بے اطمینانی پھیلے، مختلف طبقات باہم دست و گریباں ہوں اور اس طرح انگریزوں کو واجد علی شاہ کے معزول کر دینے اور اودھ کا الحاق کمپنی سے کر لینے کا جواز پیدا ہو، چنانچہ اس مذموم مقصد کے لیے بہت سی موثر "تدبیریں" مختلف اوقات میں اختیار کی جاتی رہیں انہی میں سے ایک تدبیر یہ تھی کہ علاقے کے سادہ دل مسلمانوں کو یہ یاد دلایا جائے کہ یہاں ایک مسجد تھی جو بابر نے راجہ رام چندر کے محل کو ڈھا کر بنائی تھی اور اب وہ غیر آباد ہے اور انہیں اس پر برانگیختہ کیا گیا کہ اس مسجد کو دوبارہ آباد کیا جانا چاہیے، مسجد کی بازیابی کے نعرے میں بڑی کشش تھی، پہلے غلام حسین اور پھر مولوی امیر الدین[۲] علی نے جہاد کا اعلان فرمایا۔

جہاد کا نعرہ سن کر مسلمان بہت کم ہوش میں رہتے ہیں اور حصول

شہادت کے لئے بے تابانہ دوڑ پڑتے ہیں ۔ چنانچہ بہت سے سرفروش اور نیک نیت مسلمان جمع ہو گئے، واجد علی شاہ کو علم ہوا۔ اس نے ایک مجلس مشاورت تشکیل دی مگر اس مجلس کا ایک بھی اجلاس منعقد نہیں ہونے دیا گیا۔ ایک تحقیقاتی وفد بھیجا گیا جس نے واپسی پر جو رپورٹ دی اس کا ماحصل یہ تھا کہ بالفعل تو کوئی مسجد وہاں نہیں ہے۔ البتہ دستاویزوں سے ماضی میں اس کا وجود ضرور ثابت ہوتا ہے " ایک اور وفد گیا جس نے اجودھیا کے غافل مسلمانوں کو سمجھا بجھا کر ایک اقرار نامے پر ان کے دستخط کرائے کہ انہیں مقامی ہندوؤں سے کوئی شکایت نہیں ہے اور کوئی مسئلہ باہم وجہ اختلاف نہیں " مختصر یہ کہ تحریک کی مزاحمت نیم دلانہ کی گئی اور در پردہ آگ کو بھڑکانے کی کوششیں کی گئی۔ اس لئے کہ کمپنی کا مفاد، مسئلہ حل ہونے میں نہیں تھا، مزید الجھ جانے اور بات کے بڑھ جانے میں تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ اگر واجد علی شاہ مسلمانوں کے مطالبے کو تسلیم کر کے مسجد کی تعمیر نو کا حکم دیتا ہے تو سلطنت کے عام ہندو ناخوش اور آمادۂ فساد ہو کر کمپنی کے پاس فریادی ہو کر رہ جائیں گے اور اگر مطالبے کو مسترد کر دیتا ہے تو مسلمان مشتعل ہوں گے، بدامنی پھیلے گی، کشت و خون کا بازار گرم ہو گا، دونوں شکلوں میں واجد علی شاہ کی نا اہلی و ناکامی تحقیق ہو گی اور اس کو معزول کر کے الحاق اودھ کی آرزو پوری کی جا سکے گی۔ چنانچہ کمپنی کا ریزیڈنٹ مقیم لکھنؤ بار بار بادشاہ کو مراسلات بھیج رہا تھا کہ مولوی صاحب کے فتنے کو فرو نہ کیا گیا تو سلطنت کی خیر نہیں ،، چنانچہ اس تحریک کی سربراہی کے لئے ایک ایسے

بزرگ کو آگے لایا گیا۔ جو مرشد طریقت ہونے کی بنا پر مریدین کا ایک حلقہ رکھتے تھے دوسری طرف ایسے پُر جوش اور جذباتی تھے کہ ہر قدم پر نفل ادا کرتے ہوئے حج کے لیے چل کھڑے ہوتے تھے اور ان کے مرشد کو حکماً ان کو اس ارادے سے باز رکھنا پڑا تھا۔ تیسری طرف واجد علی شاہ کے ایک درباری امیر حیدرا میٹھوی کے ہم وطن اور عزیز بھی تھے، چنانچہ مولوی صاحب جوشِ جہاد سے ایسے سرشار اور مرتبۂ شہادت کے حصول کے لئے اتنے بے تاب کر دیئے گئے کہ مسئلے کے حل کی مہلت دینے اور انتظار کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہوئے اور مقتل کی طرف سربکف چل کھڑے ہوئے اور

دی سادگی سے جان پڑوں کوہ کن کے پاؤں

اور اپنے ساتھ بہت سے سادہ دل مسلمانوں کو بھی مرتبۂ شہادت پر فائز کروادیا، اگرچہ مسئلہ جوں کا توں رہا۔

یہ تھی اصل صورت حال اور اس کے حقیقی محرکات واسباب اب دیکھنا یہ ہے کہ اس داستان میں مولانا فضل حق کا کردار کیا رہا؟ اس پورے قضئیے میں مولانا کا نام دوجگہ لیا گیا ہے۔

۱۔ واجد علی شاہ کی طرف سے جو مجلس مشاورت تشکیل دی گئی تھی اس میں شاہ کی طرف سے چار ثالث مقرر کئے گئے تھے، ان میں سے ایک نام مولانا فضل حق کا بھی تھا، حدیقۃ الشہداء میں جو اس معرکے کے سلسلے میں سب سے پہلی تحریر ہے لکھا ہے۔

"۲۷، محرم الحرام ۱۲۷۲ھ (۸، اکتوبر ۱۸۵۵ء) کو وکلائے لشکر اسلام مقام لکھنؤ میں داخل ہوئے دو ایک مہنت (مندر کے نمائندے)

بھی حسب الطلب آئے اور نواب احمد علی خان اور مولوی غلام جیلانی اور مولوی غلام امام شہید اور مولوی فضل حق خیر آبادی چار ثالث مقرر ہوئے لیکن عجب یہ ہے کہ ایک دن بھی وکلائے اسلام اور مہنتوں کارو لکاری پر مراجعہ نہ ہوا " صنـ۳۰۰ حدیقۃ الشہداء (بحوالہ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد از رئیس احمد جعفری) لاہور ۱۹۵۷ء

جب اس مجلس مصالحت کا کوئی اجلاس ہی نہیں ہوا تو مولانا کی شرکت اور کسی فریق کی حمایت یا مخالفت میں بیان یا فتوے دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ دوسرا موقع جہاں مولانا کا نام لیا گیا ہے وہ ہے جب علماء وقت سے استفتاء کیا گیا تھا۔ جب حکومتِ وقت نے دیکھا کہ یہ تحریک مذہبی نعروں کے سہارے اُٹھ رہی اور ابھر رہی ہے اور جہاد کے نام پر عوام کو ورغلایا جا رہا ہے۔ تو علماء سے کہا گیا کہ وہ راہنمائی کریں اور ہمیں اور عوام کو بتائیں کہ کیا حکم ہے! جن علماء سے پوچھا گیا ان کی فہرست میں مولانا فضل حق کا نام صرف ایک مورخ نے لیا ہے اور وہ ہے صاحب قیصر التواریخ "سید کمال الدین حیدر عرف سید محمد زائر" مگر اولاً تو زائر اس باب میں منفرد ہے کوئی دوسرا مورخ ان کا ہم زبان اور مؤید نہیں ہے۔ اس حادثے کا ذکر حسبِ ذیل کتب ورسائل میں ہے۔

۱۔ حدیقۃ الشہداء از مرزا جان طپش شاگرد میر درد مؤلف ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۶ء

۲- قیصر التواریخ جلد دوم مطبوعہ ۱۹۰۷ء نول کشور پریس۔
۳- غدر کی صبح و شام میں معین الدین حسن کا بیان ۱۸۵۷ء
۴- ضیاء اختر از محمد حسن رئیس بجنور تالیف ۱۲۹۲ھ/
۱۸۷۳ء مطبوعہ ۱۸۷۸ء
۵- بوستان اودھ از درگا پرشاد سندیلہ مطبوعہ ۱۲۹۲ھ/
۱۸۷۳ء
۶- افضل التواریخ از رام سہائے تمنا لکھنوی مطبوعہ ۱۸۷۹ء
۷- مہر جہاں تاب از سید فخر الدین بحوالۂ نزہتہ الخواطر
الجز السابع
۸- تاریخ اودھ از نجم الغنی خاں ۱۹۱۹ء

یہ سب کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں، ان میں سے ہر ایک کو اس واقعے کا معاصر مأخذ بھی کہا جا سکتا ہے، صرف آخری کتاب (تاریخ اودھ) معاصر مأخذ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مأخذ قیصر التواریخ ہے۔

زائر کا اصل نام سید کمال الدین حیدر اور عرف سید محمد زائر ہے یہ نصیر الدین حیدر ف ۱۸۳۷ء کے عہد میں ۱۸۳۵ء میں مرصد (جنتر منتر) سے وابستہ ہوئے تھے اور اس مرصد کے دو سر رشتہ انشاء و ترجمہ کتب ہیئت " میں سائنسی کتب کے اردو تراجم پر مامور ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے متعدد کتب کے ترجمے کئے تھے، زائر نے ڈاکٹر اسپرنگر اور مسٹر ایلیٹ کی فرمائش پر ۱۸۴۷ء میں اودھ کی تاریخ لکھنا شروع کی تھی اور اس کی پہلی جلد مکمل ہو کر

واجد علی شاہ کی نظر سے گذری اس نے ناپسند کیا اور اس
جرم میں زائر کو ملازمت سے الگ کر دیا گیا تھا، ملازمت سے
برطرف ہوکر زائر نے دوبارہ اس کتاب کی تکمیل کی طرف توجہ کی او
کتاب میں مزید مواد کا اضافہ کرکے اس کی ضخامت کو سہ چند کر
دیا اور اس طرح ۱۸۷۸ء میں کتاب کی تکمیل ہوئی پھر دو انگریز
نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ظاہر ہے کہ کتاب
میں شاہ کے خلاف اور انگریزوں کی حمایت میں مواد ہو
گا۔ جب ہی شاہ نے ناپسند اور انگریزوں نے پسند
کیا اور اس کا انگریزی ترجمہ کیا۔

کتاب کی طباعت کا قصہ بھی پیچیدہ ہے۔ کتاب کی تالیف
کا آغاز ۱۸۴۷ء میں اور تکمیل ۳۰ سال بعد ۱۸۷۸ء میں ہوئی
مگر اس کی طباعت ۱۹۰۷ء میں ہوئی ہمارے پیش نظر جو طباعت
ہے۔ اس کو تیسری طباعت ظاہر کیا گیا ہے اور اس کی تکمیل طباعت
۱۹۰۷ء ہے۔ کتاب کے خاتمے میں لکھا ہے۔

"اس سے پہلے یہ کتاب ..... دوبارہ مطبع منشی نول کشور
لکھنؤ میں طبع ہوئی تھی اور اب حسب الارشاد مہتممین مطبع منشی
نول کشور واقع کان پور میں بار سوم کہ حقیقت میں بار اول ہے
ماہ نومبر ۱۹۰۷ء حیطۂ طبع سے آراستہ ہوئی" دوسری جلد کے سر
ورق پر سال طباعت ماہ ستمبر ۱۸۹۶ء درج ہے مگر آخ
صفحہ (۴۷۰) پر لکھا ہے کہ پہلی طباعت کے ٹائیٹل زیادہ طبع
گئے تھے۔ (۱۸۹۶ء) اس اشاعت (سوم) میں بھی وہی ٹائیٹل

بج لگا دیئے گئے" اس جلد کے خاتمے میں لکھا ہے کہ پہلے
دو بار یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔ اب بار سوم کہ حقیقت
میں بارِ اوّل ۔ ماہ نومبر ۱۹۰۷ء طبع ہوئی" جو دو قطعات
تاریخ طباعت درج کئے گئے ہیں۔ ان میں پہلے قطعے سے
۱۹۰۷ء اور دوسرے سے ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷) برآمد
ہوتے ہیں۔

پہلی جلد امجد علی شاہ کے انتقال تک کے حالات
پر مشتمل ہے اور دوسری جلد واجد علی شاہ کی تخت نشینی سے
ہنگامہ سن ستاون (۱۸۵۸-۷ء) تک کے حالات
پر پہلی جلد کے سر ورق پر "سوانحات سلاطین اودھ" کتاب
کا نام درج ہے اور دوسری جلد کے سرورق قیصر التواریخ،
اور دونوں جلد کے ہر ہر ورق "تواریخ اودھ" خود مؤلف نے
کتاب میں کئی جگہ "تواریخ مملکت اودھ" نام لکھا ہے
ملاحظہ ہو صفحات ۱۶، ۱۷، ۱۸ جلد اوّل ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۶۲ جلد دوم
زائر، واجد علی شاہ سے ناخوش، واجد علی شاہ، زائر سے
ناخوش، وہ انگریزوں کا مدح سرا، انگریز اس کے قدرداں،
ظاہر ہے کہ وہ الحاق اودھ کی کاروائی کو حق بجانب
ثابت کرنے کے درپے ہوگا اور واجد علی شاہ کو نااہل
ثابت کر کے ہی اس کا مدعا پورا ہو ہوگا۔ علماء دین
کو متہم کرنے سے بھی وہ نہیں چوکے گا چنانچہ
معرکۂ ہنومان گڑھی کی داستاں بیاں کرتے ہوئے جب

وہ اس مرحلے پر آیا ہے کہ حکومت وقت نے علماء دین سے استفتاء کیا تو لکھتا ہے۔

(علماء ظاہر ؟) اہل سنت، مثل مولوی حسین احمد، غلام جیلانی وکیل، عدالت انگریزی مولوی محمد یوسف، مولوی فضل حق خیرآبادی مولوی سعد اللہ جو حج خانہ کعبہ سے مشرف ہو آئے تھے اور بعض علماً وگمنام نے بھی محض بطمع دنیا و بخوف حاکم فتوائے قتل عبارات مختلفہ سے رنگین کر کے دیا اور بعض علماء شاہ جہاں آباد نے بھی ایسی حجت و برہان سے لکھا یعنی جب اہل اسلام قلیل ہوں اور غلبۂ کفار ہو اس وقت، خلاف حاکم اولی الامر یعنی صاحبان عالی شان یا اہل اسلام جو ان کے اختیار میں ہوں۔ جہاد حرام ہے۔ پس جو شخص مرتکب ایسے امر کا ہو وہ باغی و طاغی ہے" ص ۱۱۵

لیکن یہی مؤلف (زائر) جس مقام پر (ص ۱۱۰ جلد دوم) علماء کے وہ فتاوی نقل کرتا ہے وہاں فتوے پر حسب ذیل علماء کے دستخط ہیں (۱) مولوی محمد یوسف (۲) مولوی سعد اللہ (۳) مولوی رحمت اللہ (۴) مولوی خادم احمد (۵) مولوی تراب علی، یعنی مولانا فضل حق جن کے مندرجہ بالا فہرست میں فتوای دینے والے علماء میں شمار کیا تھا نہ ان کا فتوای نقل کیا ہے نہ ان کے دستخط ہیں۔ مولونا فضل حق نے فتوی ہی نہیں دیا، فتوای دیا ہوتا تو نقل بھی کیا جاتا بہرحال فتوے دینے

والے علماء میں چونکہ کسی مورخ نے مولانا فضل حق کا نام شامل نہیں کیا صرف زائر نے شامل کیا ہے۔ مگر اس نے بھی سب کے فتوے نقل کیے ہیں۔ مولانا فضل حق کا یہی فتویٰ نقل نہیں کیا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا فضل حق ان علماء میں شامل نہیں تھے اور زائر نے ان کا نام بدنیتی کی بنا پر شامل کیا ہے۔

زائر کی غلط بیانی اور افتراء واتہام خود اس کی تحریر سے آشکار ہے، اس نے لکھا تھا کہ علماء نے بطمع دنیا و بخوف حاکم فتوائے قتل (مجاہدین) دیا اور یہ کہ موجودہ حالات میں جہاد حرام ہے۔ پس جو شخص مرتکب ایسے امر کا ہو وہ باغی وطاغی ہے" مگر خود اس نے جو فتاویٰ نقل کیے ہیں۔ ان میں سے کسی میں ایسے الفاظ تک نہیں ہیں۔ جن سے یہ مفہوم نکلتا ہو۔ مفتی سعد اللہ لکھتے ہیں۔

"دریں حال جماعت مولوی امیر الدین علی راقتل روانیست، بلکہ در نہی قولہ تعالے" ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ داخل شدہ ست کذا فی العالمگیریہ و ہر مرتکب منہی عنہ خواہد شد اصلاً مثاب نخواہد شد" ص۱۱ جلد دوم

ان مذکورہ حالات میں مولوی امیر الدین علی کی جماعت کے قتل (جہاد) جائز نہیں ہے بلکہ اللہ تعالے کے ارشاد کی نہی میں خود کو ڈالنا ہے۔ "ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ" (خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو) جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں مذکور

ہے اور جو شخص امر نہی کا ارتکاب کرے گا وہ ہرگز مستحق ثواب نہیں ہوگا۔

مولوی محمد یوسف کا فتویٰ :۔ فی الواقع فتح عزیمت باید کرد در شہادت دغدغہ ست مثلا

باقی علماء نے انہی فتوؤں پر تصدیقی دستخط کیے ہیں۔ خود کوئی عبارت نہیں لکھی، ان میں نہ تو ہمیں "فتوے قتل" نظر آیا نہ باغی وطاغی کے الفاظ ہماری رائے میں زائر نے ایسی غلط بیانی اور تضادات سے اپنے سارے بیان کو محل اشتباہ اور ناقابلِ اعتبار بنادیا ہے۔

ان تضادات پر مستزاد، زائر کا انفراد ہے کوئی مؤرخ مولانا فضل حق کے فتوے کا ذکر نہیں کرتا، حدیقۃ الشہداء جو اسی سال لکھی گئی۔ جس سال یہ حادثہ ہوا اور جو مولوی امیر الدین علی کی حمایت میں ہے۔ اس میں تمام فتوے نقل کئے گئے ہیں۔ مگر مولانا فضل حق کا نام نہیں ہے صاحب نزہتہ الخواطر مولوی سید عبد الحیؒ کے والد مولوی سید فخر الدین جو اس واقعہ کے معاصر تھے اپنی کتاب مہر جہاں تاب میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے اور مولوی سید عبد الحیؒ نے نزہتہ الخواطر (الجزء السابع ص ۸۱ - ۸۲) میں

یہ عبارت نقل کر دی ہے مگر اس میں بھی مولانا فضل حق کا نام نہیں ہے۔ حال آں کہ اگر مولانا کا نام ہوتا تو مولوی سید عبدالحیؒ ضرور نقل کرتے کیونکہ انہیں مولانا فضل حق اور ان کے اخلاف وتلامذہ کی تدح کا خاص ذوق تھا۔

زائر کے بعد تاریخ اودھ کے مؤلف نجم الغنی خاں نے بھی مولانا فضل حق کا مفتیوں میں شمار کیا ہے مگر

۱۔ اولاً تو وہ معاصر مؤرخ نہیں ہیں، اور وہ اس حادثے کے تین سال بعد پیدا ہوئے اور ۱۹۳۲ء میں ان کا انتقال ہوا، تاریخ اودھ انہوں نے ۱۴۱۔ ۱۹۱۰ء میں تالیف کی۔ جس کی دوسری اشاعت ۱۹۱۹ء میں ہوئی اور ہمارے پیش نظر ہے۔

۲۔ ثانیاً اس موضوع پر اس کا واحد ماخذ قیصر التواریخ ہے۔ چنانچہ انہوں نے قیصر التواریخ کی عبارت (جو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ تغیر خفیف نقل کر دی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"بعض دنیا پرست علماء اہل سُنّت نے جیسے مولوی حسین احمد ملیح آبادی

مولوی غلام جیلانی وکیل عدالت انگریزی، مولوی محمد یوسف فرنگی محلی اور مولوی فضل حق خیرآبادی اور مولوی سعد اللہ مرادآبادی اور دوسرے علماء گم نام نے محض بطمع دنیا مولوی امیر علی کے قتل کا فتویٰ عبارات مختلفہ سے رنگین کر کے دیا۔ دلّی کے بعض علماء نے بھی اسی برہان و حجّت کے ساتھ لکھا کہ جب اہل اسلام قلیل ہوں اور کفار کا غلبہ ہو اس وقت خلاف حاکم اولی الامر یعنی حاکم وقت کے جن کے اختیار میں ہوں خواہ انگریز یا مسلمان جہاد حرام ہے پس جو شخص ایسے امر کا مرتکب ہو گا وہ باغی وطاغی ہے۔"

لطف یہ ہے کہ نجم الغنی کے یہاں بھی زائر کے اتباع کے نتیجے میں وہی تضاد پایا جاتا ہے کہ فہرست میں مولانا فضل حق کا نام ہے مگر سب علماء کے فتوے ہیں، نہیں ہے تو مولانا فضلِ حق کا فتویٰ، اور یہ بھی کہ "مولوی امیر علی کے قتل" اور "باغی وطاغی" کا خود انہی کے نقل کردہ فتوؤں میں کہیں ذکر نہیں ہے۔

مختصر یہ ہے کہ زائر کا انفراد برقرار ہے، نجم الغنی
ان نہ صرف یہ کہ معاصر مؤرخ ہیں بلکہ زائر کی تیھر
تواریخ کے ناقل محض ہیں، اس لئے مولانا فضلِ حق
طرف مجاہدین کے خلاف فتویٰ دینے کی بات
رف زائر نے لکھی ہے اور اس کا قول بے اصل اور نا
قابل اعتبار ہے۔

یہ بھی ایک تاریخی لطیفہ ہے کہ مولانا فضل حق
آبادی نے ۱۸۵۵ء میں فتویٰ نہیں دیا مگر ان پر فتوے
دینے کی تہمت لگائی گئی اور ۱۸۵۷ء میں فتویٰ دیا مگر
ن کے فتوے کا انکار کیا گیا۔

(ماہنامہ ماہِ نو، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۵ء)